کراچی
آنکھ مچولی
ماہِ دسمبر
یومِ پیدائش قائدِ اعظمؒ

لذت کی دُنیا میں ایک مُعتبر نام
احمد
احمد کے جام جیلی، ٹماٹو کیچپ اور پکے پکائے کھانے اپنے منتخب اجزار، اعلیٰ معیار
اور بے مثل ذائقے کے سبب مُلک اور بیرون مُلک بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔
لذیذ اور معیاری اشیاء کے لئے ہمیشہ احمد کی مصنوعات کا انتخاب کیجئے جنھیں
برسوں سے صارفین کا اعتماد حاصل ہے۔
احمد کا نشان — معیار کی پہچان
Tomato Ketchup
AHMED
PINE APPLE JELLY
AHMED
Chicken Masala
RASPBERRY JAM
APPLE PRESERVE
(APPLE IN SYRUP)
پایا
قدرت نے ذائقہ دیا، احمد نے محفوظ کیا

UHU (یوہو) کِڈز کلب

دنیا کی سب سے اچھی GLUE بنانے والی مشہور زمانہ جرمن کمپنی ®UHU (یوہو)
نے قارئین آنکھ مچولی کے لئے پُرکشش CASH انعامات کا اعلان کیا ہے۔ درجِ
ذیل سوالات کے درست جوابات ارسال کریں اور CASH انعامات حاصل کریں۔

پہلا انعام ــــــــ	2 ھزار روپے نقد
دوسرا انعام ــــــــ	1 ھزار روپے نقد
تیسرا انعام ــــــــ	500 روپے نقد

مقابلہ نمبر ۶

1 معراج کا واقعہ کس اسلامی ماہ کی کس تاریخ کو پیش آیا؟
2 پاکستان نے آخری کون سے دو ون ڈے کرکٹ ٹورنامنٹ جیتے؟
3 دنیا کی تیز ترین سنچری کس کھلاڑی نے کتنی گیندوں پر بنائی؟
4 چولہا کیوں بدل دیا، بلب کیوں پھینک دیا؟ ان دونوں پہیلیوں کا ایک ہی جواب ہے۔ ذرا جلدی سے بتائیے
5 شعر مکمل کیجیے: ع ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

شرائط

1: جوابات کے ساتھ ایک عدد ®UHU stic پر لپٹا ہوا پلاسٹک ریپر ضرور بھیجیں۔ 2: ایک سے زائد حل کی صورت میں ہر حل کے ساتھ ®UHU ریپر بھیجنا لازمی ہے۔ 3: انعامات کا فیصلہ ایک سے زائد درست جوابات کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ کیا جائے گا۔ (4): انعامات کا اعلان حتمی اور ناقابل چیلنج ہوگا۔ 5: تمام حل 10 جنوری تک لازمی آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کریں۔ 6: خوش نصیب انعام یافتگان کا اعلان فروری کے شمارے میں کیا جائے گا۔

Don't Say GLUE — Say UHU®

مقابلہ نمبر ۳ کے نتائج صفحہ نمبر ۷ پر ملاحظہ کیجیے

دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا
اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین
وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن
مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا
ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی
کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا
تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی ۔ کراچی

انوکھے خیال اچھوتی مثال

آنکھ مچولی
کراچی

دسمبر

قائداعظم کا ماہِ ولادت

نگرانِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

تحقیق و تصنیف
محمد سلیم مُغل
محمد جاوید خالد

امورِ انتظامی
تجمل حسین چشتی
طارق فوزی

مشاورت
ڈاکٹر طاہر مسعود

امورِ تجارت
شاہد محمود

امورِ تشہیر
عمران احمد

شعبۂ تزئین
محمد سلیم اختر (خطاطی)
مومن رحیم (اسکیچز)
دانش اختر (پینٹنگ)

قائداعظم محمد علی جناح

مسلمانانِ ہند کی نئی تاریخ رقم کرنے والے اور ہندوستان کا جغرافیہ بدل دینے والے بظاہر دھان پان سے اس شخص نے یہ ثابت کر دکھایا کہ کردار کی بلندی ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتی ہے۔

واضح رہے

۱

اِس کتاب میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ (گرین گائیڈ اکیڈمی) محفوظ ہیں۔ بغیر اجازت کوئی بھی تحریر یا تصویر شائع نہیں کی جا سکتی۔

۲

اِس کتاب میں شائع ہونے والی اسلامی اور تاریخی تحریروں (بشمول قرآن و حدیث) کے سوا جملہ کہانیوں کے کردار فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۳

اِس کتاب کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیرالدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کی نشوونما اور کردار سازی کے لیے شائع کیا۔

۴

آنکھ مچولی کا یہ کتابی سلسلہ وقتاً فوقتاً شائع ہو رہتا ہے۔

قیمت - ۱۸ روپے - ۷ درہم - ۷ ریال

زرِ سالانہ

۲۸۰ روپے (مع ڈاک خرچ) پاکستان
۱۰۰ ریال (مع ڈاک خرچ) مشرقِ وسطیٰ
۱۰۰ درہم (مع ڈاک خرچ)

ناشر : ظفر محمود شیخ
طابع : زاہد علی
مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی
فون نمبر : 4942857-4948210

خط و کتابت کا پتہ

آنکھ مچولی
گرین گائیڈ اکیڈمی، اپی آئی بی کالونی، کراچی ۵

آنکھ مچولی

کا

مقابلہ نمبر

جنوری میں شائع ہورہا ہے

آپ اپنی بہترین تحریروں کے ساتھ
اِس میں شرکت کیجئے

خوبصورت کہانیوں، دلچسپ مقابلوں
اور معلوماتی مضامین کے علاوہ
نظموں، لطیفوں، کارٹون اور رنگین تصاویر کے ساتھ
اِس مقابلے میں شرکت کرنے والوں کے لیے ہمارے پاس

انعامات کے انبار ہیں

دیر نہ کیجئے

شرکت کی آخری تاریخ 30 نومبر ۹۶ء

سنہرے حروف	ادارہ	۸
پہلی بات	ڈاکٹر طاہر مسعود	۹
حمد	عابد انور	۱۰
حضرت خباب رضی اللہ عنہ	شاہد الرحمٰن چوہدری	۱۱
محنتی قائد	خواجہ رضی حیدر	۱۵
مزدور (نظم)	حُسنِ انتخاب	۱۸
اور مَنا چپ ہو گیا	نذیر انبالوی	۲۱
آجا پیاری نندیا	نگہت آراء چوہان	۲۴
سردی کا سبق (نظم)	مُحمّد رافع	۲۸
پاگل ڈاکٹر	حبدون ادیب	۲۹
سزا سے جزا تک	غلام حسین میمن	۳۴
پیاری ماں	مُحمّد ندیم اختر	۳۹
ترانۂ کشمیر (نظم)	مدرس فیض عالم	۴۴
انوکھی دُنیا (ترجمہ)	اشرف صبوحی دہلوی	۴۵
بینسن اینڈ ہیجز ورلڈ سیریز کپ	سَیّد یحییٰ حسینی	۴۷
اپنا وطن پھر اپنا وطن ہے	مرسلہ: عارف محمود قریشی	۵۴
جب وہ قائدِ اعظم بنے	عبدالستار خان طاہر	۵۷
زندگی کی حقیقت (نظم)	زرِ تاج شامی	۶۲
سونے کے ہاتھ (روسی کہانی)	ترجمہ: غلام مصطفےٰ سولنگی	۶۳
ایک لاکھ کی گیند	عبدالرحمٰن غوری	۶۷
قصہ کوئز	محمّد سلیم مُغل	۶۹
ہم پاکستانی بچے ہیں (نظم)	ضیاء خان	۷۵
لطیفے شطیفے	منتخب لطائف	۷۷
نامے میرے نام	قارئین کے خطوط	۸۱
سنہری مجسّمے	صُوفی غلام مصطفےٰ تبسّم	۸۵
نقشوں کی دنیا	شیخ عبدالحمید عابد	۸۷
پہلی بار	مُحمّد صابر	۹۱
کرکٹ (نظم)	رضیہ عزیز	۹۳
عجیب و غریب کرنسی	کمال احمد حاذم	۹۴
جادو کیا ہے ؟	نثار احمد زبیری	۹۹
پان	آغا سہیل	۱۰۷
پیاری بہنا (نظم)	مراد ہاشمی	۱۱۲
ہماری زمین پیاری زمین	عبدالستار خان طاہر	۱۱۳
قلم دوست	نو آموز قلم کار	۱۱۹
اقرأ	خالد بن محمود احمد	۱۲۰

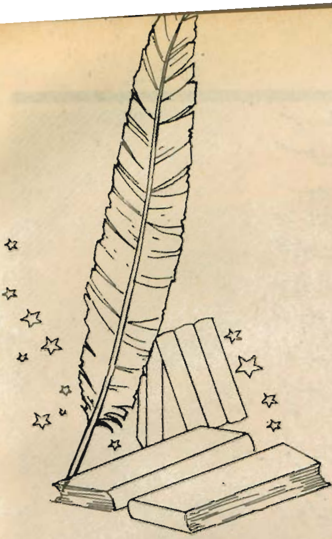

سنہرے حروف

آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ دیدوں میں سرخی تھی اور جلن ہو رہی تھی۔ یہ اللہ کے بندے جن کی آنکھیں دکھنے آئی تھیں، حضرت جنید بغدادیؒ تھے۔ بڑے اللہ والے بلکہ ولی اللہ۔ تکلیف زیادہ ہوگئی تو آپؒ نے ایک طبیب سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔ "پانی آپ کی آنکھوں کے لئے سخت مہلک ہے۔ آنکھوں کو پانی لگنے سے بچایا جائے۔"

یہ سن کر حضرت جنیدؒ نے فرمایا۔ "یہ تو ممکن نہیں۔" اس نے پوچھا۔ "بھلا کیوں؟" فرمایا "وضو جو کرنا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ "آنکھیں بچانی ہیں تو میرے مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ طبی ضرورت ہے۔" طبیب تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ لیکن نماز کا وقت آیا تو حضرت جنیدؒ نے حسب معمول وضو کیا۔ اور نماز میں مشغول ہوگئے۔

اس دن حضرت جنیدؒ جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں اتنی سرخ نہیں تھیں۔ دوسرے دن وہ طبیب آیا تو سخت حیران ہوا کیونکہ آنکھیں بہتر ہوگئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ "آپ نے کیا دوا کی؟" حضرت جنیدؒ نے فرمایا۔ "میں نے آنکھوں کے مقابلے میں آنکھوں کی ٹھنڈک (نماز) کو ترجیح دی اور وضو کرلیا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا وہی پانی جسے تم میری آنکھوں کے لئے زہر سمجھ رہے تھے، دوا بن گیا۔"

"وہ طبیب ایک مجوسی تھا، یعنی آگ کو پوجنے والا۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ "بندے کو اللہ تعالیٰ پر اس درجہ یقین ہو تو بے شک قوت ارادی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔" اس واقعہ کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ حضرت جنیدؒ کے ہاتھ پر ایمان لے آیا۔

پہلی بات

ڈاکٹر طاہر مسعود

خود غرضی اسے کہتے ہیں کہ آدمی صرف اپنے کام سے غرض رکھے۔ اسے اور کسی کے معاملے سے دل چسپی نہ ہو۔ جب اپنا کام کرے تو گدھے کو بھی باپ بنالے اور جب معاملہ اپنا نہ ہو تو کہے کہ "میری بلا سے کچھ بھی ہوتا رہے۔ مجھے کسی سے کیا لینا دینا۔" سچ پوچھیے تو یہ سخت بری بات ہے۔

خود غرضی چھپی نہیں رہتی۔ خود غرض لوگ بہت جلد پہچان لئے جاتے ہیں۔ پھر ان کی عزت اور اعتبار ختم ہوجاتا ہے۔ چونکہ خود غرض آدمی، دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچاتا اس لئے دوسرے بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح خود غرضی جو اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے کے لئے اختیار کی گئی تھی، اس سے خود اپنی ذات کو نقصان پہنچنے لگتا ہے۔

خود غرض لوگوں کے مقابلے میں ایک اور قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ انہیں بے غرض کہا جاتا ہے۔ بے غرض آدمی وہ ہوتا ہے جو کسی لالچ اور فائدے کا خیال کئے بغیر دوسروں کے کام آئے۔ ہر زمانے میں اس قسم کے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بے غرضی سے لوگوں کی مدد کرنا، انہیں فائدہ پہنچانا، ان کی خدمت کرنا، ان کے مسائل حل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ایثار اور قربانی کے جذبے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی بندے سب سے محبوب اور پسند ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ بندہ سب سے زیادہ پسند ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہو۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یقین ہے کہ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے۔ کروڑوں اور اربوں لوگ اس دنیا میں آئے اور چلے گئے۔ ایک نہ ایک دن ہمیں بھی یہاں سے رخصت ہوجانا ہے اور پھر اپنے مالک حقیقی کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اگر ہم دنیا میں دوسروں کے کام آئیں گے تو اس دن اللہ تعالیٰ کے حضور ہم سرخرو ہوں گے اور ہمیں ان تمام تکلیفوں کا پھل ملے گا جو ہم نے دنیا میں دوسروں کے لئے اٹھائی تھیں۔ وہ دن اصل کامیابی کا دن ہوگا۔ یہ دنیا کی زندگی اسی دن کی تیاری کا نام ہے۔ یہ تیاری بے غرضی اور خلوص سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

خدا ہی کی قدرت یہ سارا جہاں ہے

عابد انور

خدا نے ہی چڑیوں کا اڑنا سکھایا
خدا نے ہی بچوں کو چلنا سکھایا

خدا ہی نے گرمی سے بادل بنائے
ہواؤں سے بادل کو پیہم چلایا

خدا ہی نے بادل سے بارش بنائی
خدا ہی نے کھیتوں میں سبزہ اگایا

خدا ہی نے دنیا کے موسم بنائے
خدا ہی نے ٹھنڈی ہوا کو چلایا

خدا ہی کی قدرت یہ سارا جہاں ہے
خدا ہی نے ہم کو زمیں پر بسایا

جو راتوں کو سوئے تو کیسے اٹھے ہم؟
خدا ہی تو ہے جس نے ہم کو جگایا

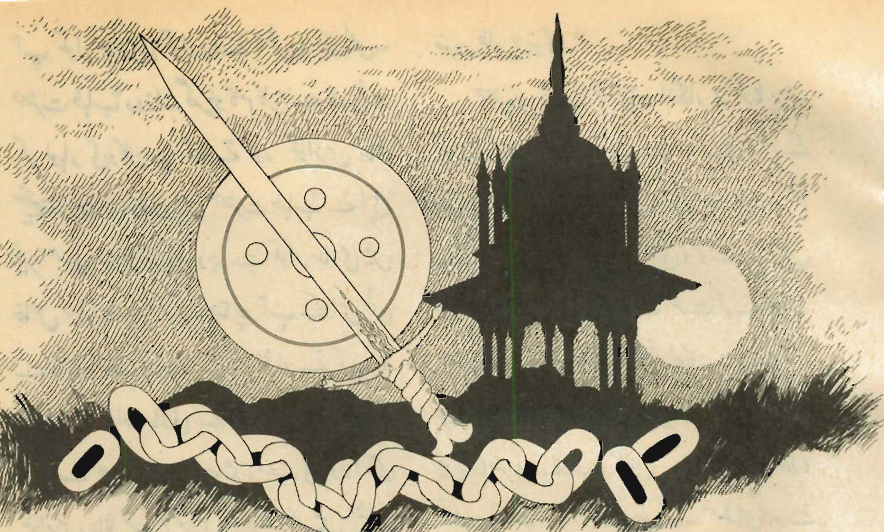

صبر و ایمان کی مثال

حضرت خبابؓ

شاھد الرحمٰن چوہدری

حضرت خباب بن ارتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار صحابہ کرامؓ اور ساتھیوں میں سے تھے۔ آپ نے دین اسلام کی خاطر بہت سی تکالیف اور مصائب کا صبر سے مقابلہ کیا۔

آپ کے والد کا نام ارت تھا۔ آپ نجد کے رہنے والے تھے اور قبیلہ بنی تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے رات کے وقت آپ کے قبیلے پر حملہ کردیا، مال اسباب لوٹ لیا اور قبیلے کے کچھ افراد کو قیدی بنالیا۔ حضرت خبابؓ بھی ان چند افراد میں شامل تھے۔ ڈاکوؤں نے آپ کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔

مکہ کی غلام مارکیٹ میں عرب کی ایک مالدار خاتون "ام انمار" نے آپ کو خرید لیا۔ ام انمار کے گھر میں حضرت خبابؓ بھی دیگر غلاموں کی طرح بڑی سختی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ایک دن ام انمار آپ کو ایک لوہار کے پاس لے گئی تاکہ

آپ تلوار سازی (تلوار بنانے کا فن) سیکھ لیں۔

حضرت خبابؓ روزانہ گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر لوہار کی دکان پر آجاتے اور تلواریں بنانا سیکھتے۔ چند ہی دنوں میں حضرت خبابؓ نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے تلوار سازی میں خاص مہارت پیدا کرلی۔ چنانچہ آپ کے اس فن سے فائدہ اٹھانے کے لئے ام انمار نے آپ کو دکان اور تلوار سازی کے آلات مہیا کردیئے۔ آپ نے تھوڑی ہی مدت میں معیاری اور اچھی تلواریں بنانا شروع کردیں اور مکہ بھر میں مشہور ہوگئے۔

مکہ کے بڑے بڑے شمشیر زن آپ کے پاس تلواریں خریدنے کے لئے آنے لگے۔ اس طرح آپ کو لوگوں سے میل جول کا موقع ملا۔ اس دوران آپ نے مشاہدہ کیا کہ طاقتور اور بااثر افراد کس طرح غریبوں اور کمزوروں کے حقوق کو بے دردی سے پامال کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مکہ کے عوام کتنی جہالت اور بے علمی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔

حضرت خبابؓ اکثر مکہ کے عوام کے افسوسناک حالات پر غور و فکر کرتے اور اپنے آپ سے کہتے : "ظلم کی یہ سیاہ رات بالآخر ختم ہو کر رہے گی اور عدل و انصاف کا سورج ضرور طلوع ہوگا۔"

حضرت خبابؓ کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد آپ نے سنا کہ بنی ہاشم کے ایک بزرگ جن کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ عوام کو سچائی اور عدل کی دعوت دیتے ہیں اور ظالموں اور جابروں سے نفرت کرتے ہیں۔ حضرت خبابؓ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ آپ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنے کانوں سے آپؐ کے وعظ و نصیحت کو سنا اور مسلمان ہوگئے۔ مسلمان ہونے میں حضرت خبابؓ کا نمبر چھٹا تھا اور آپ سے پہلے صرف پانچ آدمی مسلمان ہوئے تھے۔

حضرت خبابؓ کے مسلمان ہونے کی خبر فوراً سارے مکہ میں پھیل گئی۔ ام انمار کو پتہ چلا تو وہ بہت خفا ہوئی۔ ام انمار اپنے بھائی "سباع" اور قبیلے کے دیگر چند جوانوں کو لے کر حضرت خبابؓ کے پاس آئی اور سب مل کر آپ پر ٹوٹ پڑے انہوں نے آپ کو لوہے کی سلاخوں سے مار مار کر لہولہان کردیا۔

حضرت خبابؓ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا اور وہ اسلام کا اعلانیہ اظہار کرنے میں جرأت و دلیری کا مظاہرہ کرنے لگے۔

اسی دوران قریش کے سرداروں نے خانہ کعبہ کے پہلو میں ایک اجتماع منعقد کیا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سرداروں نے اس میں شرکت کی۔ اس اجتماع میں فیصلہ کیا گیا کہ جو افراد مسلمان ہوگئے ہیں۔ انہیں سخت سزائیں دی جائیں تاکہ وہ آنحضورؐ کے دین کو چھوڑ دیں۔

اس فیصلے کے مطابق سباع اور اس کے ساتھیوں نے حضرت خبابؓ پر روح فرسا اور صبر آزما مظالم ڈھانا شروع کردیئے۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں آپ کے ننگے بدن پر لوہے کے طوق و زنجیر چڑھا کر تپتی ریت میں اوندھے منہ لٹا دیا جاتا لیکن آپ پھر بھی کلمہ طیبہ کا اقرار کرتے۔ بڑے بڑے وزنی اور گرم پتھر آپ کے جسم پر رکھ دیئے جاتے جس سے آپ کے جسم کی چربی پگھل کر زمین پر بہنے لگتی۔

ام انمار بھی اپنے بھائی کی طرح بہت سنگدل تھی۔ ایک دن وہ حضرت خبابؓ کی دکان پر آئی۔ یہاں حضور اکرمؐ تشریف فرما تھے۔ اور حضرت خبابؓ سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ام انمار نہایت مشتعل ہوگئی اور جونہی رسول اکرمؐ وہاں سے تشریف لے گئے، اس نے بھٹی میں سے گرم پگھلتا ہوا لوہا اٹھایا اور خبابؓ کے سر پر انڈیل دیا۔ آپ کے بال جل گئے اور ان میں سے دھواں اٹھنے لگا اور آپ بے ہوش ہوگئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر مظالم میں اضافہ ہوتا جارہا تھا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کے ظالمانہ ماحول سے مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ حضرت خبابؓ بھی مسلمان مہاجرین میں سے ایک تھے۔ حضرت خبابؓ کو مدینہ میں سب سے بڑھ کر خوشی اس بات کی تھی کہ انہیں کسی رکاوٹ کے بغیر پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع مل گیا تھا۔

حضرت خبابؓ نے رسول خداؐ کے ساتھ غزوہ بدر میں شرکت کی اور مشرکین مکہ کے خلاف بڑی شجاعت سے اسلام کا دفاع کیا۔ آپ نے غزوہ احد میں بھی شرکت کی۔ اسی جنگ میں ام انمار کا بھائی سباع، حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت خبابؓ کو عمر دراز عطا کی اور آپ نے چاروں خلفاء کا زمانہ دیکھا۔ آپ نے دین اسلام کی خاطر بڑی مشکلات برداشت کی تھیں، اس لئے آپ کو مسلمانوں میں ایک خاص مرتبہ اور مقام حاصل رہا۔

تین چیزیں

○ تین چیزوں کا احترام کرو۔
والدین، استاد، قانون

○ تین چیزوں پر قابو رکھیں۔
دل، زبان، غصہ

ایک دن آپ ایک محفل میں شریک ہوئے سب نے آپ کا خاص احترام کیا۔ حاضرین میں سے ایک نے عرض کی کہ "ابتدائے اسلام میں قریش کے ہاتھوں اٹھائے جانے والے ظلم و ستم کے بارے میں کچھ بتایئے؟" حضرت خبابؓ نے پہلے انکار کیا مگر حاضرین کے اصرار پر اپنی پیٹھ کے چند زخم دکھائے انہیں دیکھ کر حاضرین کا دل بھر آیا۔ اور بے ساختہ ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "یہ زخم کیسے ہیں؟" خبابؓ نے جواب دیا "مشرکین مکہ مجھے اذیت دینے کے لئے آگ جلاتے اور پھر مجھے ننگے بدن اس پر گرا دیتے اور دائیں بائیں گھسیٹتے، یہاں تک کہ میری پشت کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو کر گرتا اور آگ میں جلنے لگتا۔ یہ زخم انہی اذیتوں کے نشان ہیں۔"

آخر عمر میں حضرت خبابؓ کافی مالدار ہو گئے تھے۔ ان کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی تھی البتہ انہوں نے اپنے مال و دولت کو اس عمدہ طریقے سے خرچ کیا کہ اس کی مثال دینا محال ہے۔ آپ روپے پیسے کو اپنے گھر میں ایک جگہ پر رکھ دیتے، دروازے کھلے چھوڑ دیتے اور غریبوں اور فقیروں کے بلا کر کہتے کہ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق وہاں سے اٹھا لے۔ غریب اور مفلس افراد اپنی ضرورت کے مطابق پیسے اٹھا کر لے جاتے۔ اس سب کچھ کے باوجود حضرت خبابؓ ہمیشہ پریشان اور فکر مند رہے کہ کہیں ان کی ذمہ داری میں کوئی کوتاہی نہ ہو جائے اور ان کا یہ مال و دولت روز قیامت جواب دہی اور عذاب کا موجب نہ بنے۔

جب حضرت خبابؓ فوت ہو گئے اور رحمت پروردگار کے زیر سایہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے جا ملے۔ امیرالمومنین حضرت علیؓ تشریف لائے اور آپ کی قبر منورہ پر کھڑے ہو کر انہوں نے چند جملے ارشاد فرمائے جن سے حضرت خبابؓ کے ایمان و تقویٰ کی بلندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپؓ نے ارشاد فرمایا۔

"اللہ سبحانہ، خبابؓ پر رحمت فرمائے جو اپنی مرضی سے مسلمان ہوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی اور زندگی بھر ایک مجاہد کی طرح زندہ رہا اور اللہ تعالیٰ نیک اعمال کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔

●●

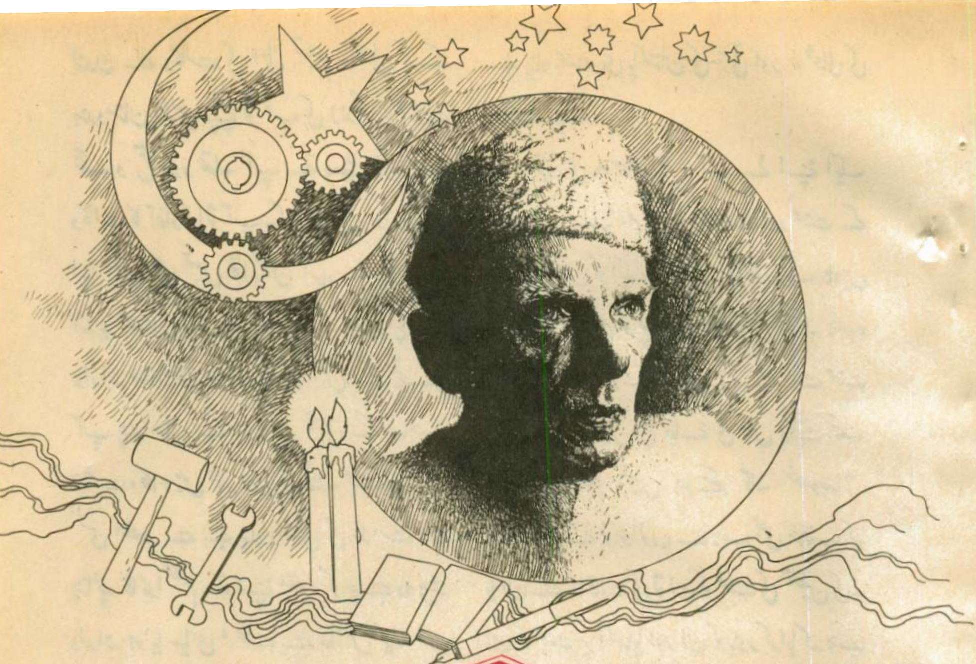

محنتی قائد

خواجہ رضی حیدر

محنت کی عظمت اور ضرورت کا ہر دور میں اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ محنت رائیگاں نہیں جاتی اور اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔ جو بچے محنت سے پڑھتے ہیں وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں اور ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ محنت آدمی کو سرخرو کرتی ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔

اسی لئے سچے رہنمایانِ قوم باربار محنت کی عظمت کو اجاگر کرتے ہیں اور اپنے عوام پر زور دیتے ہیں کہ وہ محنت اور لگن کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کو بھی بچپن سے ہی محنت سے لگاؤ تھا۔ وہ نہ صرف خود شدید محنت کرتے تھے بلکہ محنت کرنے والوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ آپ جب

لندن سے وکالت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہندوستان واپس پہنچے تو آپ کی زندگی کا نہایت تنگ و تلخ دور تھا۔ آپ نے بمبئی میں جب وکالت کا آغاز کیا تو آپ کے پاس اپنی سواری اور اپنا آفس بھی نہیں تھا، لیکن آپ نے دن رات شدید محنت کی اور بے پناہ لگن کے ساتھ اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کو فروغ دیا۔ جس کے نتیجہ میں آپ چند سال کے اندر ہی بمبئی کے صاحبِ حیثیت وکلاء میں شمار ہونے لگے۔ محنت دراصل کسی مقصد سے بے پناہ وابستگی کی علامت ہے۔ چنانچہ قائداعظم نے اپنے مقصد کو چاہے وہ پیشہ وارانہ ہو یا سیاسی، محنت سے حاصل کیا۔ اس لئے آپ کے دل میں محنت کی قدر و قیمت بہت واضح تھی۔ آپ نہ صرف خود شدید محنت کرتے تھے بلکہ اپنے رفقاء اور عوام سے بھی محنت کے خواہاں رہتے تھے۔ پاکستان کا قیام قائداعظم کی محنت کا ثمر ہی تو ہے۔ اور اس کی ترقی و خوشحالی محنت سے ہی مشروط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے تحریک پاکستان کے دوران بھی اور قیام پاکستان کے بعد بھی جب آپ اس نومولود مملکت کے گورنر جنرل تھے ...... پاکستان کے عوام سے بار بار اپیل کی کہ وہ محنت کو اپنائیں، محنت کو اپنا شعار بنائیں کیونکہ بے پناہ محنت ہی پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کی ضمانت ہے۔

فروری ۱۹۴۸ء میں آپ نے اپنے ایک پیغام میں فرمایا۔ "ہم اپنی استقامت اور محنت کے ذریعہ پاکستان کو ایک عظیم اور طاقتور ملک بنادیں گے۔" قائداعظم کو پورا پورا احساس تھا کہ جب تک قومی مقاصد کے حصول کے لئے سخت محنت اور جدوجہد نہیں کی جائے گی اس وقت تک پاکستان مستحکم نہیں ہوسکے گا۔ خصوصاً قائداعظم نے نوجوانوں سے جب بھی خطاب کیا یا ان سے ملاقات کی تو ان کو محنت کی تلقین کی۔ ان کو محنت پر اکسایا اور ان کو باور کرایا کہ جب تک وہ محنت کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنائیں گے اس وقت تک وہ ان عظیم ترین ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکیں گے جو مستقبل میں ان کے کاندھوں پر آنے والی ہیں ...... طلبہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ایک موقع پر آپ نے فرمایا۔ "ہمیں ضرورت ہے محنت کی، مشقت کی، استقامت کی اور احساس ذمہ داری کی تاکہ ہم اپنے ملک اور قوم کو پائیدار اور مضبوط بنا سکیں۔"

جون سنہ ۱۹۴۴ء میں طلبہ کے نام ایک پیغام میں آپ نے فرمایا۔ "آپ اپنی تعلیم کی طرف

سے غافل نہ ہوں۔ یہ زمانہ آپ کے علم حاصل کرنے کا ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ کو سخت محنت کرنا چاہئے۔ آپ کی تعلیمی زندگی کے یہ چند سال اگر ضائع ہو گئے تو پھر کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ان سالوں کو اپنی محنت سے یادگار اور دائمی بنادیں۔"

قائداعظم کی خواہش تھی کہ ان کی قوم دن رات مسلسل اور ان تھک محنت کرے تاکہ پاکستان ترقی، خوشحالی اور استحکام حاصل کر سکے۔ آیئے ہم عہد کریں کہ ہم قائداعظم کی خواہش کے مطابق پاکستان کے لئے سخت محنت کریں گے۔ ●●

مقابلہ نمبر ۳ کے نتائج

پہلا انعام: سعدیہ - کراچی - دو ہزار روپے نقد

دوسرا انعام: یاسر سلیم - کراچی - ایک ہزار روپے نقد

تیسرا انعام: الیاس - کراچی - پانچ سو روپے نقد

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

مزدور

آؤ! بچو! میں سناؤں داستاں مزدور کی
رحم کے قابل ہے حالت مفلس و مجبور کی

جو عمارت ہے بناتا، وہ بھی اک مزدور ہے
بوجھ لے کر جو ہے جاتا، وہ بھی اک مزدور ہے
جو ہے بچوں کو پڑھاتا، وہ بھی اک مزدور ہے
وہ جو ہے گاڑی چلاتا، وہ بھی اک مزدور ہے

وہ بھی ہے مزدور، کھیتوں میں چلاتا ہے جو ہل
شام کو پھر جس کے بازو تھک کے ہو جاتے ہیں شل
وہ بھی ہے مزدور جو لکھتا ہے نظمیں اور غزل
صرف اک مزدور ہے مزدور کا نعم البدل

اے مرے مزدور! تو ہے لائقِ صداحترام
تو ہے محنت کش، تری محنت کی دنیا ہے غلام
چاہے دنیا کچھ کہے لیکن ہے تو اعلیٰ مقام
تیری محنت، تیری عظمت کو میں کرتا ہوں سلام

پاشکستہ اپنے گھر جب شام کو جاتا ہے یہ
پا کے اجرت اور بھی مایوس ہوجاتا ہے یہ
غم کو کھاکے اور آنسو پی کے سوجاتا ہے یہ
اک نئی کل کے لئے خوابوں میں کھو جاتا ہے یہ

آؤ! بچو! میں سناؤں داستاں مزدور کی
جانے کب بدلے گی حالت بیکس و مجبور کی

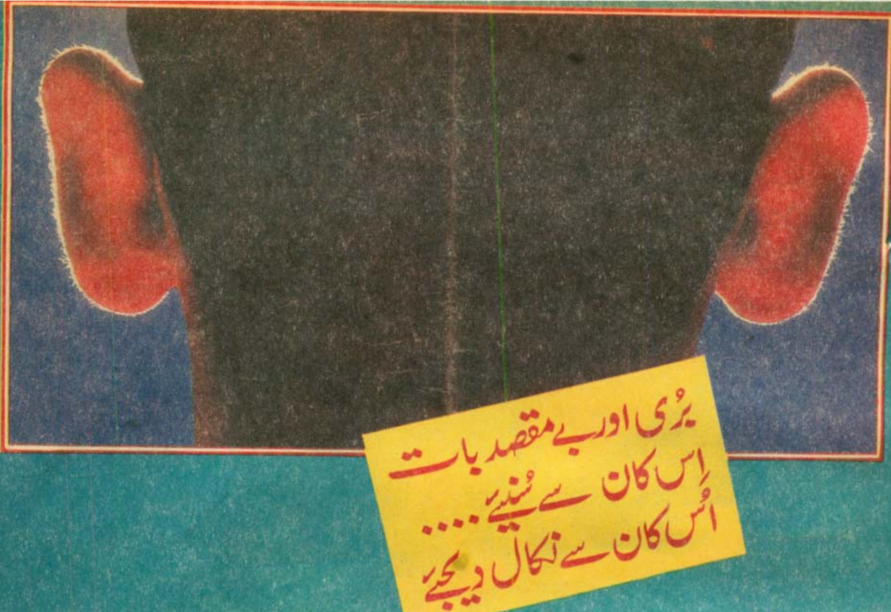
بُری اور بے مقصد بات
اِس کان سے سُنیئے.....
اُس کان سے نکال دیجئے

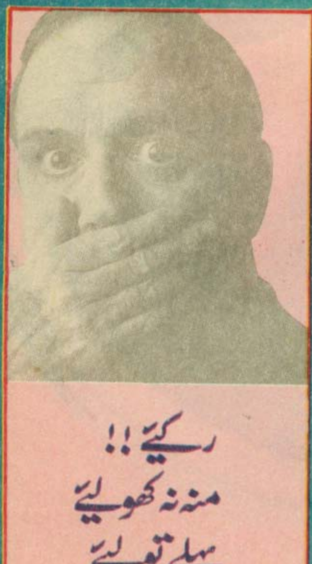
رکیئے !!
منہ نہ کھولیئے
پہلے تولیئے
پھر بولیئے

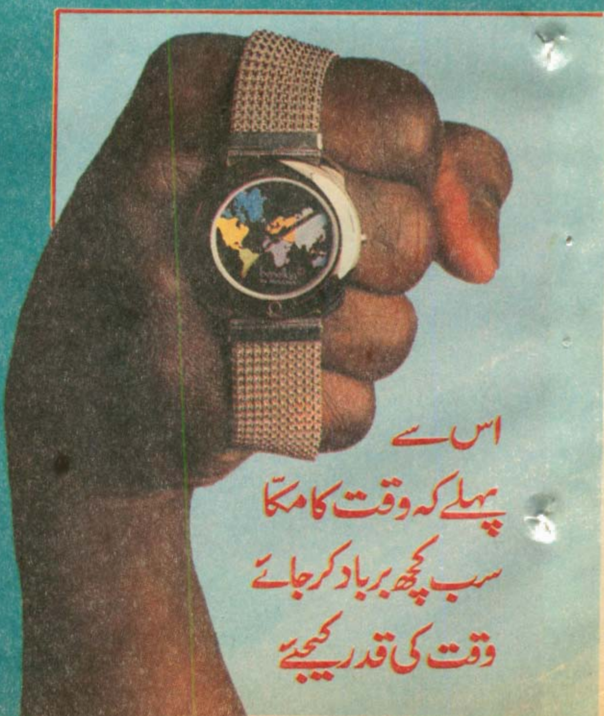
اس سے
پہلے کہ وقت کا مکا
سب کچھ برباد کرجائے
وقت کی قدر کیجئے

سبزیاں اور پھل .... سو مسئلوں کا حل

ہماری دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ان گنت نعمتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ پھل، پھول اور سبزیاں قدرت کا وہ انمول خزانہ ہیں جن سے ہمارے جسم کا نظام ہر لمحہ فعال رہتا ہے۔ کوئی سبزی آنکھ کی بینائی بحال رکھتی ہے تو کوئی جسم میں خون بناتی ہے، کوئی پھل ہماری ہڈیوں کو مضبوط رکھتا ہے تو کسی سے ہمارا نظام ہضم مستعد رہتا ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں۔ منہ نہ بنایئے۔ سبزیاں بھی کھایئے

اور مُنّا چُھپ گیا

نذیر انبالوی

جمال دین کاندھے پر کدال رکھے قبروں کے درمیانی راستے سے ہوتا ہوا برگد کے ایک بوڑھے درخت تلے بیٹھ گیا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اسی قبرستان کے ایک کچے سے مکان میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے بابا اور دادا دونوں گورکن تھے۔ یہ ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ بابا جان نے اسے یہ کام سکھادیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد وہ اب اکیلا اتنے بڑے قبرستان میں قبریں بنانے کا کام کرتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کی عمر دس برس تھی جبکہ چھوٹا تین برس کا تھا۔ پچھلے دو دن سے قبرستان میں کوئی جنازہ نہیں آیا تھا۔ اس نے ایسے وقتوں کے لئے کچھ پیسے جمع کئے تھے مگر اس کی جمع پونجی بڑے بیٹے کے علاج پر خرچ ہوگئی تھی۔ وہ اچھا بھلا تھا مگر ایک دن اچانک اس کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ وہ لمحوں ہی میں بے حال ہوگیا۔ وہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ

کرنے کے بعد کہا۔
"یہ اپنڈکس کا درد ہے۔ اس کا آپریشن ہو گا۔"
"آپریشن ہو گا۔" جمال دین چکرا سا گیا۔
"ہاں اب یہی اس کا واحد حل ہے۔ زیادہ دیر کی تو مریض کی جان بھی جا سکتی ہے۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔
"ڈاکٹر صاحب اگر آپریشن ہی واحد حل ہے تو پھر اللہ کا نام لے کر آپ آپریشن کریں۔" جمال دین نے کہا۔
آپریشن پر اچھا خاصا خرچ اٹھا۔ جمال دین خوش تھا کہ چلو اس کے بیٹے عمران کی جان تو بچ گئی۔ اب وہ جو پیسے کماتا روز کے روز خرچ ہو جاتے۔
"آپ کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کر لیتے۔" اس کی بیگم اپنے گھر کی مالی حالت دیکھ کر اسے مشورہ دیتی۔
"نیک بخت کیا باپ دادا کا کام چھوڑ دوں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جمال دین اسے تسلی دیتا۔
وہ برگد کے پیڑ تلے سوچوں میں گم تھا کہ اسے منے کی رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھوک سے بلک رہا تھا۔
"آج بھی اگر کوئی جنازہ نہ آیا تو منے کے لئے دودھ کہاں سے آئے گا۔ شیر فروش نے تو کل ہی ادھار دودھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔" وہ بڑبڑایا۔
منے کے رونے کی آواز اب زیادہ تیز سنائی دینے لگی تھی۔ وہ بے چین سا ہو گیا۔ اس نے اپنی کدال غصے سے زمین پر ماری۔ اس کا کیسا پیشہ تھا وہ اپنے رزق کے لئے دعا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آسمان کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ منے کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی تھی۔
"ابا جان ..... ابا جان امی جان گھر بلا رہی ہیں۔" عمران نے اس کے قریب آکر کہا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ہو لیا، جب وہ گھر پہنچا تو منا رو رو کر سو چکا تھا۔
"منے کے لئے دودھ کا بندوبست کریں ورنہ یہ روتے روتے مر جائے گا۔" اس کی بیگم بولی۔
"بیگم میں کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بازار کی طرف چل پڑا۔ بازار میں خاصا رش تھا۔ وہ جب اونچے تھڑے کی ایک دکان کے قریب پہنچا تو سامنے ایک بڑی سی توند والا آدمی بیٹھا تھا۔
"لالہ جی آدھا کلو دودھ دے دیں۔"
"اوے پیسے لائے ہو؟" دکاندار کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

"وہ جی میں کل دے دوں گا۔"

"کل بھی تم یہی کہتے تھے کہ پیسے کل دے دوں گا۔ اوئے میں نے تمہیں دودھ ادھار دینے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ .... چلو پیسے لے کر آؤ۔"

جمال دین نے التجا کی مگر دکاندار پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بوجھل قدموں سے قبرستان کی طرف چل پڑا۔

منا ابھی تک سو رہا تھا۔ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر بیگم سارا معاملہ سمجھ گئی تھی۔ وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔

"اے اللہ ہمارے لئے رزق تنگ کیوں ہوگیا ہے۔ اپنی رحمت کر ہم پر رزق کے دروازے کھول دے۔ اے اللہ ہم پر رحم کر۔"

جمال دین خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ آدھ گھنٹہ بعد منا بیدار ہوا۔ اٹھتے ہی اس نے پہلے کی طرح رونا شروع کردیا۔ جمال دین تڑپ کر رہ گیا۔ وہ کتنا بے بس تھا۔ منا روتے روتے بے حال ہوگیا۔اس کی ماں نے اس کے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکائے۔ وہ چند لمحوں کے لئے چپ ہوا پھر بلک بلک کر رونے لگا۔ شام تک وہ اسی طرح روتا رہا۔

مغرب کی اذان ہوتے ہی آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا۔ جمال دین مایوسی کی حالت میں گھر کی دہلیز پر بیٹھا تھا کہ ایک مانوس سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"جمال دین...... جمال دین۔"

اپنا نام سن کر وہ آواز کی سمت چلا۔ چند ساعتوں بعد وہ آواز دینے والے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ آواز دینے والے کو دیکھ کر چونکا۔

"لالہ جی آپ ...... خیریت تو ہے۔" شیر فروش اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"خیریت ہوتی تو میں یہاں آتا؟ میرا چھوٹا بیٹا چھت سے گر کر ہلاک ہوگیا ہے۔ تم اس کے لئے قبر تیار کردو۔ ایک گھنٹہ بعد ہم جنازہ لے آئیں گے۔" لالہ جی نے کہا۔لالہ جی کے جاتے ہی جمال دین نے ایک جگہ کا انتخاب کرکے کدال سے زمین کھودنا شروع کردی۔ اس کی کدال تیزی سے چل رہی تھی کیونکہ منے کے دودھ کا بندوبست ہوگیا تھا۔ منے کی امی جان کی دعا قبول ہوگئی تھی۔ منا اب چپ ہوجائے گا۔ اسے دودھ مل جائے گا۔ یہ نظام کائنات ہے کہ کسی کی موت کسی دوسرے کے لئے زندگی کا پیغام لاتی ہے۔

انجا پیاری شیا

نگہت آرا چوہان

زندگی بڑی تیزی سے رواں دواں ہے۔ انسان دن رات کام کاج میں مصروف ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھکاوٹ کا احساس لازمی اور قدرتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کام کی زیادتی کے باعث جو ذہنی دباؤ اور تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے یہ مزید کام کرنے کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ اور دوسروں سے سبقت لے جانے پر اکساتا ہے۔ کیا ان کا یہ نظریہ درست ہے؟ کیا اس دنیا میں آرام کی کوئی اہمیت نہیں؟

آیئے تاریخ کے اوراق الٹیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ میں زبردست قحط پڑ گیا۔ لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔ اشیا کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ پیداوار بڑھانے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ہفتے میں ۷۰ گھنٹے کام کیا جائے۔ اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود بھی پیداوار میں کوئی اضافہ نہ

ہوا۔ وجہ ظاہر تھی کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھکا ماندہ انسان پوری تندہی سے کام نہیں کر سکتا تھا۔ جب کام کرنے کے اوقات پانچ گھنٹے کم کئے گئے تو پیداوار دگنی ہو چکی تھی۔ پس کام کرنے کے لئے آرام درکار ہے۔

طویل تھکاوٹ کے باعث انسان میں مختلف بیماریوں کے خلاف قوت مزاحمت کم ہو جاتی ہے اور وہ ان بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کام کاج کے دوران انسانی مشینری مختلف قسم کے مادے پیدا کرتی رہتی ہے جو عام حالات میں خود بخود تحلیل ہو جاتے ہیں۔ جب معمول سے زیادہ کام کیا جائے تو ایک تیزابی مادہ عضلات میں جمع ہو جاتا ہے جس سے تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ دوبارہ کام کاج کے قابل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس مادہ کو ٹھکانے لگایا جائے صرف آرام ہی وہ ذریعہ ہے جو یہ کام سر انجام دے سکتا ہے اور چونکہ نیند آرام کی بہترین صورت ہے اس لئے اس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اکثر لوگوں کو تھکاوٹ، مایوسی، عضلات میں تناؤ اور کھچاؤ کی شکایت رہتی ہے۔ چونکہ ان کے جسم کے باقی ماندہ اعضا مثلاً دل، معدہ، جگر اور پھیپھڑے معمول کے مطابق کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحبان ان کو حیاتین یا طاقت کی گولیاں دے دیتے ہیں لیکن ان سے افاقہ نہیں ہوتا۔ ان میں اکثریت ایسے مریضوں کی ہوتی ہے جن کو یہ تکلیف کم خوابی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہ شکایت مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ دیکھنے میں آئی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے عورتوں کی نیند مردوں سے کم ہوتی ہے۔ وہ معمولی سی آواز مثلاً بچے کے رونے یا برتن گرنے سے فوراً بیدار ہو جاتی ہیں اور گھنٹوں کروٹیں بدلنے کے بعد نیند کی آغوش میں جاتی ہیں۔ جبکہ مرد اول تو ان آوازوں سے بیدار نہیں ہوتے اگر ہو بھی جائیں تو فوراً دوبارہ خراٹے لینے لگتے ہیں۔ نیز عورتوں کو گھر کے کام کاج بچوں کی نگہداشت اور اس قسم کی دیگر مصروفیات اتنی ہوتی ہیں کہ ان کو سونے کے لئے وقت کم ملتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اس تکلیف کی شکایت کرنے لگتی ہیں۔ ایسے مریضوں کو ڈاکٹر کے علاج سے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اپنے سونے کے اوقات میں اضافہ کرنے سے ان کی یہ تمام تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو کم از کم آٹھ یا نو گھنٹے سونا چاہئے۔ مختلف لوگوں کے سونے کا وقت مختلف ہے۔ سونے کے وقت اور نیند کی گہرائی میں گہرا تعلق ہے۔ تھوڑے عرصے کی گہری نیند طویل عرصے کی نیند سے کہیں بہتر ہے جس میں انسان بار بار بیدار ہو۔ انسان اس دنیا میں خوابیدہ حالت میں وارد ہوتا ہے اور اپنی زندگی کا تقریباً ایک تہائی حصہ سونے میں ہی گزار دیتا ہے۔ جدید تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ بوڑھوں اور جوانوں کے لئے نیند کا یکساں وقت درکار ہے۔ انہیں چوبیس گھنٹوں میں کم از کم سات گھنٹے سونا

چاہئے جبکہ بچے تقریباً بیس یا بائیس گھنٹے سونے میں گزارتے ہیں۔ دوپہر کے وقت ایک یا دو گھنٹے سولینا صحت کے لئے انتہائی مفید ہے۔ اگر یہ عادت نہ ہو تو چند دن کی کوششوں سے انسان اس کا عادی بن سکتا ہے۔ شروع شروع میں بعض لوگوں کو کاہلی اور سستی کا سا احساس ہوتا ہے اور بعض اوقات رات کی نیند میں بھی کمی آسکتی ہے لیکن جب یہ روزانہ کا معمول بن جائے تو دوپہر کے ایک یا دو گھنٹے کی نیند رات کی نیند کو مزید خوشگوار اور پر سکون بنا دیتی ہے۔

نیند کی گہرائی اور وقت دن کے کام کاج کی نوعیت پر منحصر ہے اگر انسان دن کے وقت سخت قسم کی مشقت سے کام لے گا تو اس کی نیند کم گہری ہوگی اور شدید تھکاوٹ بے خوابی کا باعث ہوگی اگر دن سکون سے گزرتا ہے تو نیند بھی پر سکون گہری اور طویل ہوگی۔ کسی سے جھگڑ کر یا غصے کی حالت میں یا جذبات کی رو میں ہو کر سونے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔ سوتے وقت سوچنے سے حتی الامکان اجتناب کرنا چاہئے جتنی سوچ گہری ہوگی نیند بھی اتنی ہی دور بھاگتی جائے گی پر سکون نیند کے لئے پر سکون دماغ ضروری ہے۔

یہ نیند آخر ہے کیا؟ یہ ایک طبعی عمل ہے۔ یہ کیوں آتی ہے؟ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بارے میں مختلف نظریات ہیں بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جب دماغ کو باہر سے محرکات کی رسد ملنا بند ہو جاتی ہے تو دماغ بھی عضلات میں تحریک پیدا کرنا بند کر دیتا ہے اور عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور انسان عالم خواب میں داخل ہونے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب دماغ میں خون کی بہم رسانی کم ہو جاتی ہے تو غنودگی کا احساس ہونے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ کھانا کھانے کے کچھ وقت کے بعد نیند کا احساس ہونے لگتا ہے چونکہ اس وقت خون زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہضم شدہ خوراک کو جذب کرنے میں مصروف ہوتا ہے اس لئے دماغ کو خون کم پہنچتا ہے۔ سب سے پہلے انسانی جسم کے بڑے عضلات اور بعد میں چھوٹے عضلات ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں اس طرح شعوری حرکات و سکنات کی قوت کم ہونے لگتی ہے۔ پہلے قوت باصرہ اور آخر میں قوت سامعہ۔ نیند کا پہلا ایک گھنٹہ انتہائی گہرا ہوتا ہے اس کے بعد نیند کی گہرائی کم ہونے لگتی ہے۔ صبح کے چار بجے کے بعد دوبارہ نیند کی گہرائی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

انسانی دماغ انتہائی نازک واقع ہوا ہے اور انسانی جسم کا یہی وہ حصہ ہے جو نیند سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ نیند دماغ کے مختلف حصوں میں توازن قائم رکھتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح طویل استعمال کے بعد الیکٹرانک کمپیوٹر اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے اور اسے دوبارہ استعمال کے قابل بنانے کے لئے اپنی پہلی حالت میں لانا ضروری ہے، بالکل اسی طرح دماغ کو دوبارہ کام کاج کے قابل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو پہلی

حالت میں لایا جائے اور یہ کام نیند انجام دیتی ہے۔ کم خوابی، بے خوابی، یا بد خوابی سے بد ہضمی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ علاوہ ازیں نیند کے دوران دل کے کام کرنے کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ نبض کی رفتار مدہم پڑ جاتی ہے۔ نظام ہضم تیزی سے کام شروع کر دیتا ہے۔ معدے کی رطوبتوں کی پیدائش میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا لیکن اس کی حرکات تیز ہو جاتی ہیں۔

بے خوابی یا کم خوابی دور کرنے کے لئے خواب آور گولیوں کا استعمال انتہائی مضر ہے اور اکثر مہلک ثابت ہو چکا ہے۔ انسان ان کے استعمال سے چند گھنٹے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا رہتا ہے لیکن بعد کے واقعات اور اثرات قطعی خوش کن، حوصلہ افزا اور اطمینان بخش نہیں۔ چونکہ ان کا اثر بیداری کے بعد بھی جاری رہتا ہے اس لئے دل کی دھڑکن بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ بہت دیر تک چکر سے آتے رہتے ہیں اور جب تک دوا کا اثر پوری طرح زائل نہ ہو جائے انسان کو آرام نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے استعمال سے مکمل پرہیز کرنا چاہئے اور ان کے بغیر سونے کی عادت ڈالنا چاہئے ●●

سردی کا سبق

محمد رافع

و! سن لو میری کہانی ۔ کی تھی میں نے کیا نادانی
ح جب اسکول چلا تھا امی نے تو بہت کہا تھا!
نا سردی بہت ہے باہر سوئیٹر پہن لو اندر جا کر
ان مری بیمار جو ہو گے کیا گزرے گی دل پر ماں کے"
نک کے بولا میں امی سے "بیماری کے مزے انوکھے
وپ اور انڈے، یخنی، حلوے کھاتے ہیں سب نخرے کرکے
ائی جب بیمار ہوا تھا! کتنا موٹا ٹھیک ہوا تھا!!"
ی آخر رہ گئیں کہتی "بیٹا باہر بہت ہے سردی"

جی میں تھی کچھ اور ہی ٹھانی
میں نے ماں کی بات نہ مانی

ستے میں پھر لگی جو سردی اور چلا میں جلدی جلدی
کول پہنچ کر یہ تھی حالت کھانسی، چھینکیں اور خجالت!!
ی کی ہی کیا کمی تھی یارب شام کو آئے نزلہ صاحب
اں کا سوپ اور کیسے حلوے کڑوی دوا تھی درد کے جلوے
تا میں یہ سوچ رہا تھا امی نے تو سچ ہی کہا تھا!
ن جو لیتا ماں کا کہنا! پڑتا نہ یہ سب کچھ سہنا
تمہیں وہ بات بتاؤں جو سیکھا میں نے سکھلاؤں

مانو تم بھی ہاں امی کی
تم ہی دل ہو، جاں امی کی

پاگل ڈاکٹر

جدون ادیب

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتے ہی اس نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو کون؟" اس نے ماؤتھ پیس ہاتھ میں لے کر کہا۔

"چیف بات کررہا ہوں۔ اس ہفتے کا اسکور؟" دوسری طرف سے رعب دار آواز سنائی دی۔

"آٹھ ....." اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"گڈ" .....!

"تھینک یو چیف!"

"اپنی رفتار بڑھانے کی کوشش کرو! اوکے.....!" رابطہ منقطع ہوگیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

ڈاکٹر مجیب ایک مریض پر جھکا ہوا تھا' مریض درد سے کراہ رہا تھا اس کے جسم کے مختلف حصوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چہرے سے وہ ایک شریف اور وضع دار نوجوان دکھائی دیتا تھا!

"کیا بہت زیادہ تکلیف ہورہی ہے؟" ڈاکٹر نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا!

"ڈاکٹر صاحب! سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ

رہا ہے۔" مریض نے نحیف آواز میں کہا۔
"رات کو بھی سکون سے نہیں سو سکا!"
"تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے فکر نہ کرو۔" ڈاکٹر مجیب نے مہربان لہجے میں کہا اور نرس کی طرف مڑ کر بولا "سسٹر انجیکشن لاؤ!"
چند لمحوں بعد وہ مریض کو انجیکشن لگا کر دوسرے مریض کی طرف بڑھ رہا تھا۔
دوسرے مریض کے بستر کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا مریض کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھرنے لگے تھے اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں......

☆ --- ☆ --- ☆

"ارے غازی تم.....!"
ڈاکٹر مجیب راؤنڈ پر تھا کہ ایک مریض کو دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔
مریض کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک دوڑ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔
"مجیب آپ ڈاکٹر بن گئے.....؟"
ڈاکٹر مجیب نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور بولا "ہاں...... لیکن تم" ......!
مریض جس کا نام غازی تھا اداس انداز میں مسکرا دیا۔ "بس ڈاکٹر قسمت کو آپ سے ملانا تھا اس لئے میں یہاں آگیا۔!"
"مگر یہ ہوا کیسے؟"
"مجھے پاکستان کا نام لیوا ہونے کے جرم میں میرے اپنے کلمہ گو بھائیوں نے زخمی کردیا ڈاکٹر! میرے جسم پر لگے زخم تو آپ ٹھیک کردیں گے مگر جو زخم دل پر لگے ہیں وہ کون مسیحا ٹھیک کرے گا.....؟"
غازی کے لہجے میں دکھ نمایاں تھا! ڈاکٹر نجیب مڑا اور نرس سے بولا "سسٹر! غازی کے لئے پلیز! پرائیویٹ روم ارینج کریں یہ میرا دوست ہے!"
"میں..... میں پرائیویٹ روم کا خرچہ نہیں اٹھا سکوں گا مجیب بھائی!" غازی نے کہنا چاہا
"ارے یار میں ہوں نا!" ڈاکٹر نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
اور غازی کی آنکھوں میں احسان مندی کے سائے لہرا گئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

ڈاکٹر مجیب اور غازی ایک ساتھ سائنس کالج میں پڑھتے تھے۔دونوں دوست تھے اور دونوں کا خواب ڈاکٹر بننا تھا پھر غازی ڈاکٹر مجیب کو بتائے بغیر کالج چھوڑ کر چلا گیا اور اب کئی برسوں بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔
ڈاکٹر مجیب کے حکم پر غازی کو ایک

پرائیویٹ روم میں منتقل کیا جاچکا تھا اور اس وقت ایک نرس غازی کے زخموں کی ڈریسنگ کررہی تھی۔ نرس کے جانے کے بعد ڈاکٹر مجیب نے غازی سے کہا "ہاں غازی اب بتاؤ کہاں تھے تم اور یہ کیا چکر ہے؟"

غازی کے لبوں پر ایک اداس مسکراہٹ عود کر آئی اس نے ایک لمحہ کو آنکھیں بند کیں اور پھر آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر! آپ کو میرے گھریلو حالات کا تو پتہ تھا! والد صاحب بڑی مشکل سے میرے تعلیمی اخراجات اٹھا رہے تھے' اپنے والد کے بعد میں ہی گھر کا بڑا تھا جب میں نے محسوس کیا کہ اب والد صاحب میرے اخراجات اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو میں نے سائنس کالج چھوڑ کر شام کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔"

غازی کہتے کہتے ایک لمحہ کو رکا۔ "وقت گزرتا رہا میں دن میں ایک جگہ نوکری کرتا اور شام میں پڑھتا۔ پھر میں نے جرنلزم میں ایم اے کرلیا اور ایک اخبار میں مجھے نوکری مل گئی۔ ڈاکٹر! آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے حالات کتنے خراب ہوگئے ہیں پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں! میں نے اپنے بھائیوں کو سمجھانے اور پاکستان کی سالمیت برقرار رکھنے کے لئے وطن دشمن عناصر کے بارے میں لکھنا شروع کردیا اور اسی پاداش میں مجھ پر حملہ کرکے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی.....!"

"کیا تم نے ایف آئی آر درج کروائی!" ڈاکٹر مجیب نے پوچھا۔

"وہ جیسے بھی تھے میرے اپنے تھے۔" غازی کے لہجے میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔

"حالات اس اسٹیج پر پہنچ گئے ہیں کہ پاکستان کی تقسیم ناگزیر ہوچکی ہے!"

ڈاکٹر مجیب کے تبصرے پر غازی تڑپ کر بولا "ڈاکٹر! کیسی باتیں کررہے ہیں آپ! بھلا دل کے بھی ٹکڑے ہوا کرتے ہیں!"

ڈاکٹر مجیب مسکرا کر بولا۔ "تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا!"

"ڈر کیسا ڈر! وطن کی خاطر جان دینا تو فخر کی بات ہے اور پھر ایک غازی کے مرجانے سے یہ سلسلہ رک نہیں جائے گا ایک غازی کے مرنے سے لاکھوں غازی اور آجائیں گے! غازی کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہوگیا۔" آج پاکستانیوں کے نام پر جن بہاریوں کا خون بہایا جارہا ہے یہ کون ہیں؟ دشمن کی باتوں میں آکر پاکستان کو توڑنے کی باتیں کرنے والے یہ بنگالی کون ہیں؟ یہ سب وہی لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان بنایا

تھا......"

"مثال کے طور پر پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا....."

ڈاکٹر مجیب نے کہا اور میز پر پڑی ٹرے سے انجیکشن اٹھایا!

"سب کچھ تباہ ہو جائے گا سب کچھ!" غازی کے لہجے میں حسرت تھی۔

ڈاکٹر مجیب نے ایک شیشی اٹھا کر دوائی انجیکشن میں انجیکٹ کی اور بولا۔ "مغربی پاکستان والوں نے کبھی بنگال کو اس کا حق نہیں دیا غازی! تم تو ایک بے باک صحافی تھے تم نے اس مسئلہ پر کیوں نہیں لکھا!"

غازی نے آستین اوپر کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا "ڈاکٹر مجیب! آپ بھی......"

"میں کیا سب انصاف مانگتے ہیں غازی۔" ڈاکٹر مجیب نے روئی سے غازی کے بازو کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"انصاف کے نام پر بربادی مانگی جا رہی ہے۔ پاکستان کو توڑنے کی یہ ہندوستانی سازش ہے!" ڈاکٹر مجیب نے سوئی غازی کے بازو میں داخل کردی اور بولا "بنگال کی آزادی کا وقت آگیا ہے اور.......!"

اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ غازی کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"اور.....؟" غازی نے ڈاکٹر مجیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں!

"اور تمہاری موت کا بھی......"

غازی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں پارہ دوڑنے لگا ہو۔

"ڈاکٹر مجیب! یہ کیا کردیا آپ نے .....!"

غازی کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے۔

"وہی جو مکتی باہنی کے ایک ادنیٰ رکن کا فرض تھا۔" ڈاکٹر مجیب قہقہہ لگا کر بولا غازی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔

"ڈاکٹر مجیب! ڈاکٹر تو ایسے نہیں ہوتے!" غازی نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔ "آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا! کیا آپ لوگ جب ڈاکٹر بنتے ہیں تو یہی حلف اٹھاتے ہیں کہ ہم لوگ زندہ لوگوں کو لاشوں میں تبدیل کردیں گے......."

ڈاکٹر مجیب دیوانہ وار قہقہے لگا رہا تھا!

"آپ پچھتائیں گے ڈاکٹر........!"

ڈاکٹر مجیب رک گیا۔ "کون میں یا بنگال کی آزادی چاہنے والے.....!"

"دونوں ڈاکٹر دونوں ...." غازی کی ہمت دم توڑنے لگی اس نے زیر لب کلمہ پڑھا اور اور گرتی ہمت کو مجتمع کرکے مسکرایا اور بولا۔

"پاکستان زندہ باد!"

اور اس کی گردن ڈھلک گئی!

ڈاکٹر مجیب کو یوں محسوس ہوا جیسے غازی نے مرتے مرتے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہو اور وہ بے بسی اور غصے سے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

ڈھاکہ کی گلیوں میں ایک پاگل نظر آنے لگا' الجھے میلے کچیلے بال' پھٹے پرانے کپڑے اور ہونٹوں سے بہتی رال! اک نمونۂ عبرت بنا ہوا تھا!

اچانک ہی وہ سڑک پر نمودار ہوا' پان کے ایک کھوکھے کی طرف بھاگا' اور کھوکھے کے قریب آکر گردن جھٹک کر بولا۔ "کیا بنگال آزاد ہوگیا؟"

کھوکھے پر چند آدمی کھڑے تھے جو حیرت و ترس کا ملا جلا تاثر لے کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے! "کیا بنگال آزاد ہوگیا؟..... نہیں ہوا کب ہوگا؟" وہ پھر بولا اور قہقہے لگانے لگا۔یکدم اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور وہ بھاگتا ہوا مڑ گیا!

"کون تھا یہ؟......!" ایک نوجوان نے بوڑھے کھوکھے والے سے پوچھا!

"ماضی کا ڈاکٹر مجیب اور حال کا پاگل!" بوڑھے کے لہجے میں دبی دبی نفرت تھی!

"ڈاکٹر یہ پاگل کیسے ہوگیا!" نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔

بوڑھے نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا "۲۳ مارچ کو جب پورے بنگال میں یوم مزاحمت منایا جارہا تھا تو ایک مریض اسپتال میں لایا گیا جس کو بری طرح مارا گیا تھا اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے پاکستان کا پرچم لہرایا تھا' اس پاگل ڈاکٹر مجیب نے غصے میں آکر اسے زہر کا انجیکشن لگادیا اور بعد میں جب اس نے اس بوڑھے زخمی کا چہرہ دیکھا تو وہ اس کا باپ تھا۔" "اوہ ......!" کئی لوگوں کے منہ سے نکلا!

بوڑھا کہہ رہا تھا "اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کلمہ گو بھائیوں میں موت تقسیم کی اور شاید اس نے اپنے حصے کی موت بھی کسی کو دے دی تھی اِسی لئے آج یہ موت کو ترس رہا ہے! مگر موت کو اس پر ترس نہیں آرہا اور آئے بھی کیوں؟" بوڑھا کچھ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ ہر طرف سکوت چھا گیا تھا' گہرا سکوت۔ اس سکوت کو صرف ایک چیز توڑ رہی تھی' ڈاکٹر مجیب کے قہقہے۔

سزا سے جزا تک

غلام حسین میمن

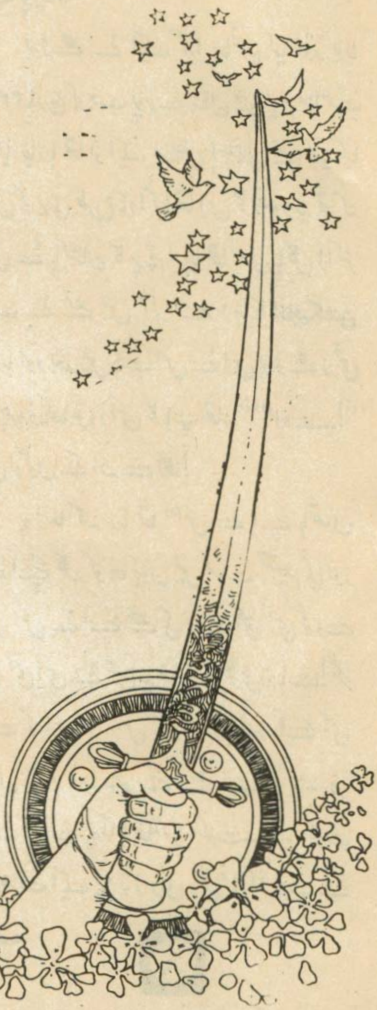

"سر میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"

"فوج اور انکار؟ ناممکن!!"

میجر میسی نے جیسے ہی اپنے افسر سے یہ کہا تو انہیں حکم عدولی کی بناء پر معطل کر کے حراست میں لے لیا گیا۔ فوراً" دوسرے برٹش میجر کو ان کی جگہ جلیانوالہ باغ بھیج دیا گیا۔ یہ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کی تاریخ تھی۔ جب متحدہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں، مسلمانوں اور ہندوؤں نے برطانوی راج کے خلاف امرتسر کے مشہور باغ میں آل انڈیا کانگریس اور تحریک خلافت کا مشترکہ جلسہ کیا۔ جلسے کا مقصد رولٹ ایکٹ کے منظور ہونے اور ترکی میں خلافِ عثمانیہ ختم ہونے پر ایک مذمتی قرارداد منظور کرنا تھا۔ جس میں حکومت کا ہر طرح سے بائیکاٹ کیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ حکومت کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔

گورنر پنجاب مائیکل ایڈوائیر نے لاہور ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ "ڈائر" کو مکمل اختیارات کے ساتھ اس جلسے کو منتشر کرنے کا حکم دیا۔ جنرل ڈائر نے یہ کام میجر میسی کے سپرد کیا تھا۔ میجر میسی کے حکم پر فوج نے باغ کے چاروں

اطراف اور گرد و نواح کے مکانوں کی چھتوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔قریب تھا کہ اجلاس شروع ہوتے ہی میجر میسی کے حکم سے نہتے عوام گولیوں سے بھون دیئے جاتے، مگر شاید کسی غیبی طاقت نے میجر میسی کو اس کام سے باز رکھا۔ انہوں نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ جب تک کوئی دوسرا آفیسر نہ آجائے، کارروائی نہ کرنا اورخود میجر میسی نے ہیڈ کوارٹر جاکر اس کام کے کرنے سے معذرت کرلی۔

دوسرے میجر نے پہنچتے ہی فائر کا حکم دیا۔ وہ باغ جس میں عوام کا ہجوم اتنا تھا کہ تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی، انسانی خون میں نہا گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ساٹھ ستر ہزار کے اس مجمع میں بہ مشکل پانچ ہزار افراد اپنی جان بچا کر بھاگ سکے جو بچ گئے وہ شدید زخمی تھے۔ عوام سراپا احتجاج بن گئے تو جنرل ڈائر اور مائیکل ایڈوائیر کو اس عظیم قتل عام پر صرف ملازمت سے فارغ کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

میجر میسی کا حکم عدولی پر کورٹ مارشل ہوا۔ ان کی ترقی واپس لے لی گئی اور انہیں دوبارہ لفٹیننٹ بنا کر انگلستان بھیج دیا گیا۔ آٹھ نو سال کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر میجر بنے اور ہندوستان آئے جہاں اٹک کے قلعے پر ان کی تعیناتی ہوئی۔

ایک روز فائلوں میں غرق میجر میسی کی نظر گراؤنڈ میں سزا پانے والے قیدی پر پڑی۔ سخت گرمی میں بہت دیر تک بھاگنے کے بعد جب اسے ستانے کی تھوڑی مہلت ملی تو اس نے منہ، ہاتھ اور پاؤں ایک خاص طریقے سے دھوئے اور اپنی عبادت میں مصروف ہوگیا۔ اس نے پانی کا ایک قطرہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارا تھا۔ میجر میسی نے اسے اپنے پاس طلب کیا اور پوچھا۔

"اتنی سخت سزا کے بعد تم نے بجائے آرام کے، یہ کیا کرنا شروع کردیا......؟"

قیدی نے جواب دیا "میں مسلمان ہوں اور نماز ظہر ادا کررہا تھا۔"

"مگر تم نے سخت گرمی کے باوجود پانی کیوں نہیں پیا......؟" میجر میسی نے دوبارہ حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ مہینہ رمضان کا ہے اور میں روزے سے ہوں۔روزے میں ہم مسلمان صبح صادق سے سورج غروب ہونے تک کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں۔"

ایک معمولی سپاہی کی مذہب سے اس قدر وابستگی میجر میسی کے لئے حیرت انگیز تبدیلی کا باعث بنی۔ انہوں نے اسلام پر انگریزی میں کتب اور قرآن مجید کا ترجمہ حاصل کرکے مطالعہ شروع کردیا۔ نرم دل میں سچائی کی تلاش

کا جذبہ شروع ہی سے موجود تھا۔ اسلام کی سچی تعلیمات نے اسے اور متاثر کیا۔ اب ان کا زیادہ وقت اسلام کے مطالعے پر صرف ہونے لگا۔ فوجی معمولات میں کمی آنے لگی اور پھر ایک روز برطانوی حکومت کا یہ میجر حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔ان کا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔

اب سزا کا دوسرا دور شروع ہوا۔ پہلی بار نہتے عوام پر گولیاں نہ برسانے پر ان کی ترقی واپس لے لی گئی تھی۔ اس بار پھر کورٹ مارشل ہوا۔ اب جرم زیادہ سنگین تھا چنانچہ انہیں ملازمت سے سبکدوش کردیا گیا۔ جائداد' سامان اور تمام بینک بیلنس تک سرکار ضبط کرلیا گیا۔ عبدالرحمٰن کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ان کی مطالعے کی تمام کتب بھی ضبط ہوگئی تھیں جن کا انہیں بے حد افسوس تھا۔ اس کے باوجود اسلام کی سچی دولت پاکر وہ مسرور تھے' بے حد خوش اور مطمئن۔

اب عبدالرحمٰن کو سرچھپانے کے لئے گھر اور گزر بسر کے لئے ملازمت کی ضرورت تھی۔ خالی ہاتھ تھے لیکن ایمان کی دولت ان کے پاس تھی۔انہیں خدا پر کامل یقین تھا کہ یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی اور شیخ عبدالقادر کی معرفت ریاست بہاولپور کے نواب سرصادق محمد خان عباس سے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے عبدالرحمٰن کو ریاست بہاولپور میں لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ پیش کیا۔ جسے عبدالرحمٰن نے خوشی خوشی قبول کرلیا۔ انہوں نے جلد ہی ریاست کی فوج کا معیار برطانوی افواج کے معیار کے برابر کردیا۔ کچھ عرصے بعد ان کی شادی ایک معزز خاندان کی بیوہ سے ہوگئی۔ جس خدا کو ماننے کے جرم میں عبدالرحمٰن سے جو مراعات چھینی گئی تھیں' اسی خدا نے ان مراعات سے کہیں زیادہ اپنے بندے کو لوٹا دیا۔ اللہ اکبر۔

لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحمٰن نے اپنی باقی زندگی فوج اور اسلام کے لئے وقف کردی۔ جون ۱۹۳۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ڈیرہ نواب صاحب سے احمد پور اور بہاولپور جانے والی سڑک کے درمیان آج بھی ان کی آخری آرام گاہ موجود ہے۔ کیا خوبصورت جرم تھا جو ان سے سرزد ہوا اور کیسی اچھی سزا تھی ان کی جس نے ان پر ہمیشہ رہنے والی جزا کے دروازے کھول دیئے۔

ماخذ: عبدالغنی فاروق، ہم مسلمان کیوں ہوئے۔

فرق بتایئے

دونوں تصاویر کو غور سے دیکھئے۔ اوپر والی بادبانی کشتی اس کشتی کا ہو بہو نمونہ ہے جس پر کولمبس نے دنیا کا سفر کیا اور نئی دنیا دریافت کی۔ نیچے والی تصویر میں آرٹسٹ سے ۲۰ غلطیاں ہوئی ہیں۔ گھڑی دیکھ کر ان ۲۰ غلطیوں کو پکڑنے کی کوشش کیجئے۔ ایک منٹ میں غلطیاں پکڑ لیں تو آپ جیت گئے۔ نہ پکڑ سکے تو آرٹسٹ جیت گیا۔

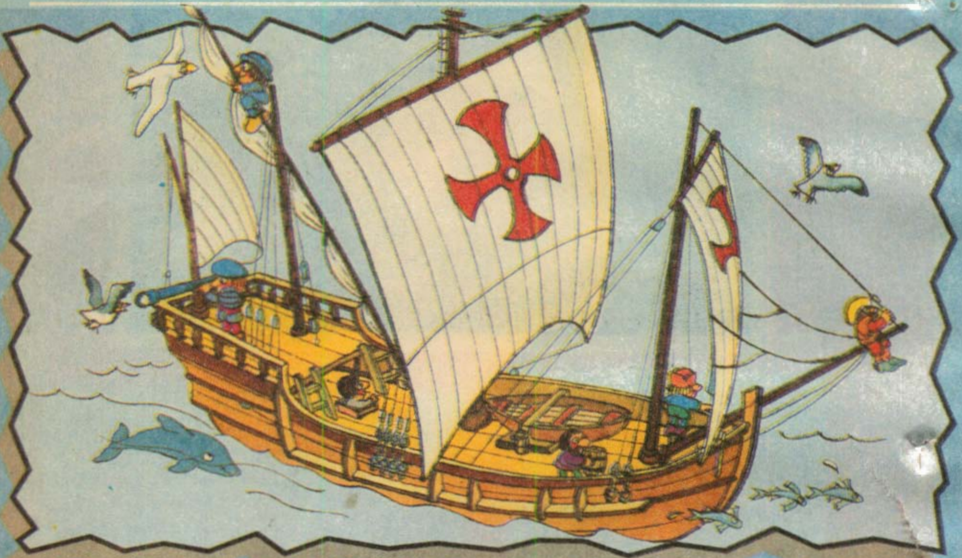

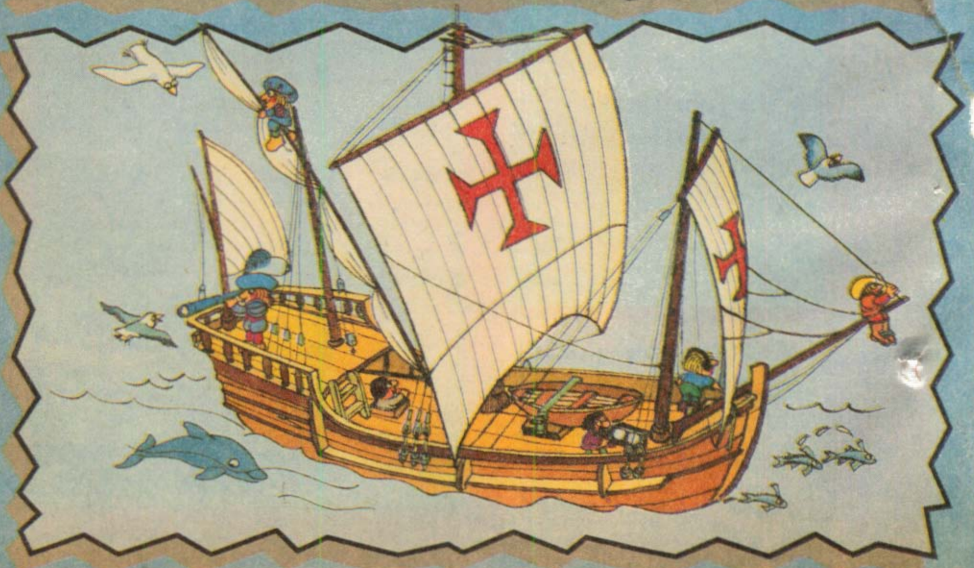

خدا نے بنائی ہے مخلوق کیا کیا

آپ نے شاید ایسا عجیب و غریب جانور پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ یہ بندروں کی ایک مخصوص قسم ہے جسے "مارموسیٹ" کہتے ہیں۔ جنوبی امریکہ اور برازیل کے برساتی جنگلوں میں پائی جانے والی بندروں کی یہ قسم جملہ بندروں میں سب سے چھوٹی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے سر پر مخصوص انداز کے بالوں نے اسے عام بندروں سے مختلف اور عجیب و غریب بنا دیا ہے۔ رات کو درختوں کے بڑے دھانے والے سوراخوں میں رہنے والا یہ مارموسیٹ دن بھر اپنی نسل کے دیگر دوستوں کے ساتھ درختوں کی شاخوں پر جھولتا ہوا کیڑوں مکوڑوں اور پھلوں پر گزارا کرتا ہے۔

پانی کے قرب و جوار میں رہنے والا، بڑی مہارت سے مچھلیاں پکڑنے والا یہ عجیب و غریب پرندہ "ہیرن" ہے۔ گردن اٹھائے، پر پھیلائے اس وقت یہ ہیرن سورج سے تمازت حاصل کر رہا ہے۔

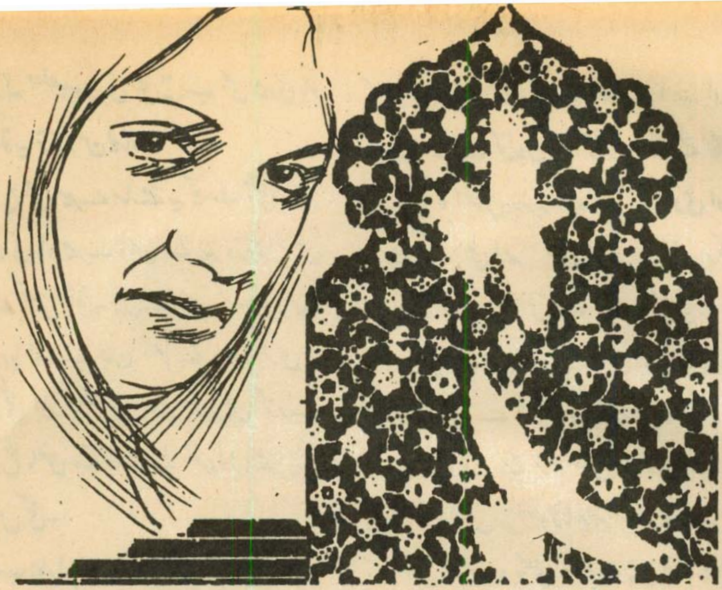

پیاری ماں

محمد ندیم اختر

پیاری ماں مجھ کو تیری دعا چاہئے
جب شہادت ملے مجھ کو کشمیر میں اور کیا چاہئے

اس ترانے کے الفاظ جب بھی میرے کانوں سے ٹکراتے تو میری مامتا تڑپ کے رہ جاتی۔ آج میں اس خار دار چمن میں بالکل تن تنہا تھی میں ہی کیا، اس مقبوضہ کشمیر، "چناروں کے دیس" میں رہنے والی اور بھی میرے جیسی مائیں بالکل تنہا تھیں۔ اس کشمیر میں میری آدھی زندگی گزر گئی۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے بہت سے بہنوں کے بھائی، ماؤں کے جگر کے ٹکڑے بھیڑ بکریوں کی طرح کٹتے دیکھے۔ بہنوں، بیٹیوں کے سروں سے آنچل اترتے دیکھے۔ وہ سب کچھ دیکھا جس کو دیکھنے کے بعد انسان جینے کی آرزو نہیں رکھ سکتا۔ انسان جیتے جی مر جاتا ہے لیکن دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے زندہ رہتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میرا اپنا بیٹا علی احمد مجھ سے بچھڑ گیا۔ یہ ترانے والی کیسٹ بھی اسی نے لاکر دی تھی۔ وہ کہتا تھا۔ "پیاری ماں" جب میں شہادت کا رتبہ پالوں تو میرے لئے تب بھی دعا کرنا۔ رونا کبھی نہیں ....! تم یہ سمجھنا کہ ایک شہید کی ماں

ہوں نہ کہ "نصیبوں کی جلی"۔ جب بھی میری یاد ستائے تو یہ ترانہ سن لینا۔

آج بھی میرے سامنے یہ کیسٹ آگئی۔ اور علی احمد کی یاد میرے ذہن کے بند دریچوں میں چپکے سے گھس آئی۔ میں نے اس کیسٹ کو ٹیپ میں لگا دیا اور بے جان جسم کے ساتھ کرسی پر ڈھیر ہو گئی اور آنکھیں موند لیں۔ میں گزرے ہوئے تلخ ماضی کے دھندلے جھروکوں میں چپکے سے گھس گئی۔

جب ہمارا پورا خاندان تھا۔ اس کے بعد یہ دن کتنا عجیب تھا۔ جب میں بالکل تنہا تھی۔

"پیاری ماں ...... پیاری ماں! یہ دیکھیں میرے لئے ابو جان کلاشنکوف لے کر آئے ہیں۔" علی احمد بھاگتا ہوا آیا اور میرے گلے سے چمٹ گیا۔ وہ ہمیشہ مجھے پیاری ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے لبوں سے یہ الفاظ بہت شیریں انداز میں نکلتے تھے۔ جب وہ پیاری ماں کہتا تو میں بے دریغ اس کا منہ چوم لیتی۔

کلاشنکوف کھلونا، محض ایک کھلونا تھا میں نے اسے چمکارتے ہوئے پوچھا : "بیٹا کیا کرو گے اس کا؟"

"پیاری ماں میں اس سے ان وردی والوں کو ماروں گا۔ جنھوں نے میرے دوست علی اصغر کو مار ڈالا تھا۔" اور پھر کلاشنکوف کا منہ اوپر کر کے منہ سے گولیوں کی آوازیں نکالنے لگا۔

میں اس کا انمول جذبہ دیکھ کر مسکرا دی اور سوچنے لگی۔ علی احمد اسی عمر میں یہ جذبہ رکھتا ہے تو جوان ہو کر اس کے جذبے کا پیمانہ کیا ہوگا۔ میں اکثر اس کے جذبے کی قدر کرتی اور میں نے اسے بہادری سے لڑنے کی تربیت دینا شروع کردی۔ کیونکہ بچے نرم شاخ کی مانند ہوتے ہیں۔ انہیں جس رخ موڑنا چاہو موڑ سکتے ہو۔

اس وقت وہ چھٹی جماعت میں تھا۔ جب اس نے اچانک ایک رات جگاتے ہوئے کہا۔ "پیاری ماں دیکھو باہر سے گولیوں کی کتنی بھیانک آوازیں آرہی ہیں۔ پیاری ماں یہ آوازیں کب تک آتی رہیں گی؟" وہ اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی پیاری ماں کہہ کر پکارتا تھا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہا۔ "بیٹا یہ آوازیں انشاء اللہ جلد ہی ختم ہو جائیں گی۔"

"پیاری ماں یہی بات آپ کب سے کہتی چلی آرہی ہیں۔ لیکن آوازیں ہیں کہ مسلسل آتی رہتی ہیں۔ میں یہ آوازیں پیدا کرنے والوں کو ماروں گا۔" میں اسے طفل تسلیاں دے رہی تھی۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اب طفل تسلیوں کا دور نہیں رہا۔ اور میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ اور

پھر اچانک زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ میں سہم کر رہ گئی۔ میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ چھلک پڑے۔ "یا اللہ خیر" علی احمد کے ابو کی آواز تھی۔ آواز کسی کرب سے لبریز تھی میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ پھر جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا وہ کسی بپھرے ہوئے طوفان سے کم نہ تھا۔ خون میں لت پت علی احمد کے ابو صحن میں گر پڑے۔ پتہ نہیں کب سے کسی کے آسرے پر اپنے قدموں پر کھڑے تھے۔ میرے لئے وہاں کھڑے رہنا محال ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی دبیز چادر آگئی۔ علی احمد بھی بھاگتا ہوا باہر صحن میں آیا اور وہ بھی اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اور فرط غم سے اپنے ابو سے چمٹ گیا۔ میری تو دنیا لٹ گئی تھی۔

وہ دن ہمارے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ جس دن علی احمد کے ابو کا جنازہ گھر سے اٹھا۔ میرا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ علی احمد کا بھی برا حال تھا۔

پتہ نہیں وہ انجانے میں کیا کیا بول رہا تھا۔ "ابو جان آپ ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ نے تو وعدہ کیا تھا۔ لیکن وعدہ بھی بھول گئے۔" مجھے تو اپنا ہوش نہیں تھا۔ کئی بار فرط غم سے بے ہوش ہوئی۔ اب کی بار بے ہوش ہوئی تو جب ہوش آیا تو میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ علی احمد کے ابو منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔

ایک دن علی احمد اسکول سے واپس آیا تو مجھ سے لپٹ گیا اسے جب بھی کوئی بات منوانا ہوتی تو یہی طریقہ استعمال ہوتا میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج بھی کوئی خاص بات ہے، جو وہ منوانا چاہتا ہے۔

"پیاری ماں میں آپ سے ایک بات کہوں؟"

"کہو کیا بات ہے؟" میں نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے پوچھا۔

وہ جلدی سے اٹھا اور اندر سے ٹیپ اٹھا لا اور پھر بستے کی جیب میں سے ایک کیسٹ نکالی او ٹیپ میں لگادی میں ساکن بیٹھی اس کی تمام حرکات دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اچانک ٹیپ میں سے یہ آواز ابھری۔

پیاری ماں مجھ کو تیری دعا چا
بس شہادت ملے مجھ کو کشمیر میں اور کیا چا

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ علی اح کیا کہنا چاہ رہا ہے بہرحال میں نے اس سے پوچ ہی لیا۔ "علی بیٹا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"امی جان میں جہاد میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔" وہ پہلے مسکرایا اور پھر اپنا مقصد بیان کیا۔

"تھوڑا سا اور صبر کرلو ابھی تم آٹھویں میں ہو۔ بس کچھ ہی عرصہ بعد تمہیں میں اجازت دے دوں گی۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ چپ کرنے کی بجائے بولا۔ "میں کب تک صبر کروں؟ بہت وقت گزر گیا کیا آپ مجھے اس وقت جہاد پر بھیجیں گی۔ جب میں اسکول سے آتے ہوئے علی اصغر، علی نواز کی طرح گولیوں کی بھینٹ چڑھ جاؤں گا۔" اور بھی اس نے بہت کچھ کہا۔ نتیجہ کے طور پر مجھے ہتھیار ڈالنا پڑے حالانکہ میں ماتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے منع بھی کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے اس پاک دھرتی کا حق بھی ادا کرنا تھا۔ اور بھی بہت سی مائیں تھیں۔ جنہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے کبھی چھوٹنے نہیں دیا تھا۔ میں نے بھی ان کے دیکھا دیکھی صبر کا دامن ہاتھ میں تھام لیا۔

علی احمد چلا گیا۔ وہ ہفتے میں تقریباً" دو چکر لگا جاتا اور مجھے مل جایا کرتا۔ اب تو میں ترس گئی ہوں۔ اس کو دیکھنے کو، اس کے الفاظ سننے کو۔ جب کبھی اکیلی بیٹھی ہوتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہو۔ "پیاری ماں..... پیاری ماں......!"

ہفتے مہینے میں تبدیل ہو گئے۔ تقریباً" چار ماہ گزر گئے۔ لیکن ان چار ماہ میں علی گھر نہ آیا۔ میں بہت پریشان تھی۔ ایک دن تقریباً" دوپہر کے وقت دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے دو نوجوان کھڑے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم علی احمد کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے علی احمد کا رقعہ دیا اور چلے گئے میں اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ بیٹھ کر دو گھونٹ پانی ہی پی لو۔ بس میں علی احمد کا رقعہ دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے رقعہ میں لکھا تھا۔ "پیاری ماں" سلام بیکراں! آپ بھی پریشان ہوں گی کہ میں چار ماہ سے گھر کیوں نہیں آیا۔ دراصل ہم ایک محاصرے کے دوران پکڑ لئے گئے تھے۔ اور انڈین آرمی والے ہمیں ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ تین ماہ ہم وہاں قید رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی شیریں دعاؤں کے طفیل ہمیں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ ایک دن ہمارے ساتھیوں نے ان آرمی والوں سے رات کے گھور اندھیرے میں زبردست مقابلہ کیا۔ اور ہمیں آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ ماں آپ میرے لئے دعا تو کرتی ہوں گی کیونکہ میں دو دفعہ موت کے منہ سے بچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر پچھلے دنوں آرمی والوں نے

محاصرہ کرلیا۔ ہمارے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہماری تمام امیدیں ختم ہو گئیں۔ بس ایک واحد سہارا تھا اللہ بابرکت کو یاد کیا تو ایک طرف سے ایک فوجی نمودار ہوا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ اپنی گن سیدھی کرے گا لیکن اس نے ہمیں وہاں سے بھاگ جانے کو کہا۔ اور کہنے لگا "یہاں سے بھاگ جاؤ کیوں اپنی جانوں کے دشمن بنے پھرتے ہو۔ اگر مقابلہ ہوا تو کوئی تمہارا مرے گا اور کوئی نہ کوئی ہمارا بھی ساتھی موت کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔" ہم موقع پاکر نکل آئے۔ ماں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی اب ہم سے تنگ آچکے ہیں۔ اور صرف بھارتی حکمرانوں کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ پیاری ماں میں تیرہ تاریخ کو گھر آؤں گا۔ میرا انتظار کیجئے گا۔"

آپ کا بیٹا

علی احمد

میں نے خط کو بار بار پڑھا اور ہر بار چوم لیا۔ ابھی تیرہ تاریخ میں چار دن باقی تھے۔ یقین جانیے کہ یہ چار دن میں نے ایک ایک پل گن کر گزارے۔ چار دن گزر گئے چوتھے دن صبح صبح دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں سمجھی علی احمد آگیا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گئی۔ میں نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو علی کی جگہ اس کے چار ساتھی کھڑے تھے۔

"علی احمد کہاں ہے؟" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ انہوں نے جواب کی بجائے علی کے کمانڈر کا ایک رقعہ تھمادیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔ "اماں علی احمد آرمی والوں سے لڑائی کرتا ہوا اس پاک دھرتی کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا گیا۔ اس نے شہادت کا رتبہ پالیا۔" ان میں سے ایک روہانسے انداز میں بولا۔ میرا دل چاہا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں لیکن پھر مجھے علی احمد کے وہ الفاظ یاد آگئے۔ جو اس نے جاتے وقت کہے تھے کہ پیاری ماں جب میں شہید ہو جاؤں تو جو میرے ساتھ میری شہادت کی خبر لے کر آئیں۔ ان کی خاطر تواضع شہد اور دودھ سے کرنا۔ میں نے انہیں صحن میں چارپائی پر بٹھایا اور شہد اور دودھ سے ان کی مہمانداری کی۔ وہ سب میرے اس رویے پر حیران تھے لیکن میں نے ایک آنسو تک نہیں بہایا۔ آج ایک عرصہ گزر گیا لیکن مجھے کسی نے پیاری ماں کہہ کر نہیں پکارا میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جب کبھی تنہائی میں علی احمد کی یاد شدت سے آتی ہے تو میرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے۔ "پیاری ماں ...... پیاری ماں ......! میں یہاں ہوں۔"

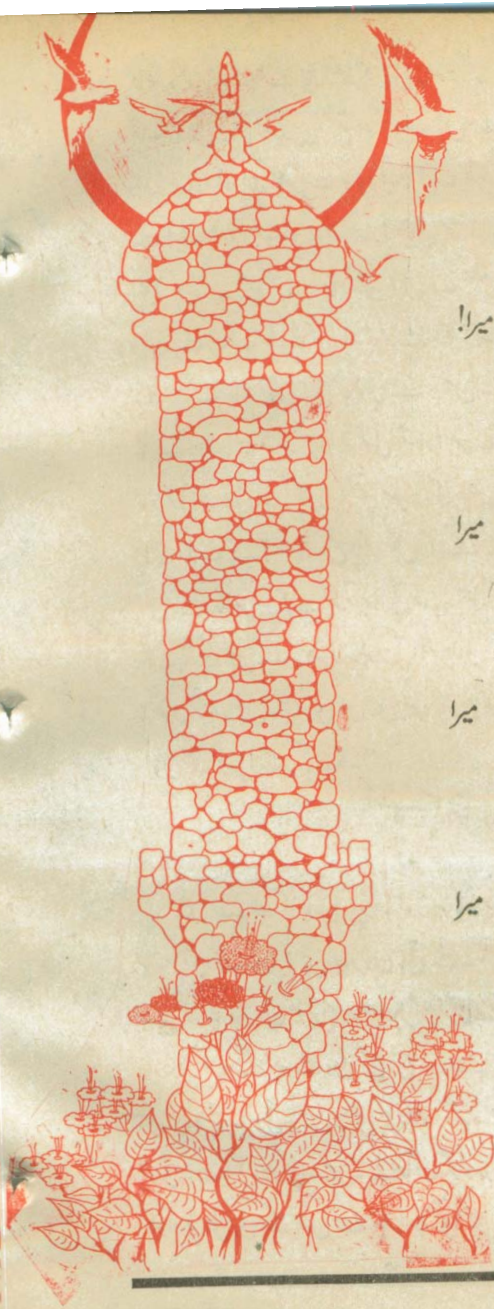

ترانۂ کشمیر

مدرس فیض عالم

دل و جان سے پیارا ہے کشمیر وطن میرا!
سبز پہاڑ اس کے، شاداب چمن اس کے
نبو کے فوارے ہیں سب سرو سمن اس کے!
جھیلوں کا نظارا ہے کشمیر وطن میرا

م کی حرارت سے جب برف پگھلتی ہے
ں دیس کی دھرتی پھر سونا ہی اگلتی ہے
قدرت نے سنوارا ہے کشمیر وطن میرا

ت کی دولت سے معمور کیا جس کو
جنت ارضی سے مشہور کیا جس کو
فطرت نے نکھارا ہے کشمیر وطن میرا

مرد مجاہد جاگ اک وقت کو آنا ہے
وطن کو بھارت سے آزاد کرانا ہے
دل نے یہ پکارا ہے کشمیر وطن میرا

انوکھی دنیا

ترجمہ: اشرف صبوحی دہلوی

کتوں کو ہانپنے سے پسینہ نہیں آتا۔ نہ ان کی کھال کو پسینہ آتا ہے بلکہ صرف ان کے تلووں کو پسینہ آتا ہے۔

بلیاں گھپ اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کی آنکھوں کی اندرونی پچھلی سطح ایسی ہوتی ہے کہ ذرا سی بھی روشنی ہو تو اسے منعکس کردیتی ہے۔ اس سے ایک چمک پیدا ہوتی ہے اور بلی کو نظر آنے لگتا ہے۔ اگر بالکل روشنی نہ ہو اور اس کا عکس نہ پڑے تو بلیوں کو انسانوں کی طرح اندھیرے میں سجھائی نہیں دیتا۔

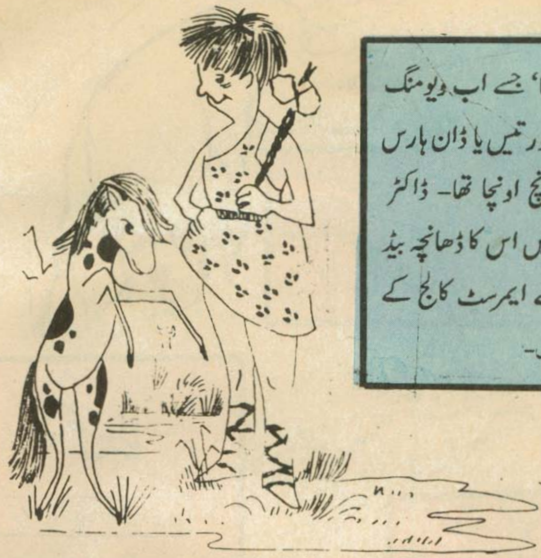

دنیا کا پہلا گھوڑا وہ تھا، جسے اب ویومنگ کہتے ہیں۔ اس کو ایوہپس بورتیس یا ڈان ہارس کہتے تھے۔ وہ صرف نو انچ اونچا تھا۔ ڈاکٹر فریڈرک بریوسٹر کو ۱۹۰۳ء میں اس کا ڈھانچہ بیڈ لینڈس میں ملا تھا۔ آپ اسے ایمرسٹ کالج کے عجائب خانے میں دیکھ سکتے ہیں۔

امریکی ہرن پیدا ہونے کے ایک منٹ بعد آدمی سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے۔ اور اگر وہ دس منٹ کا ہو جائے تو ایک تیز رفتار گھوڑے کو مات کر سکتا ہے۔

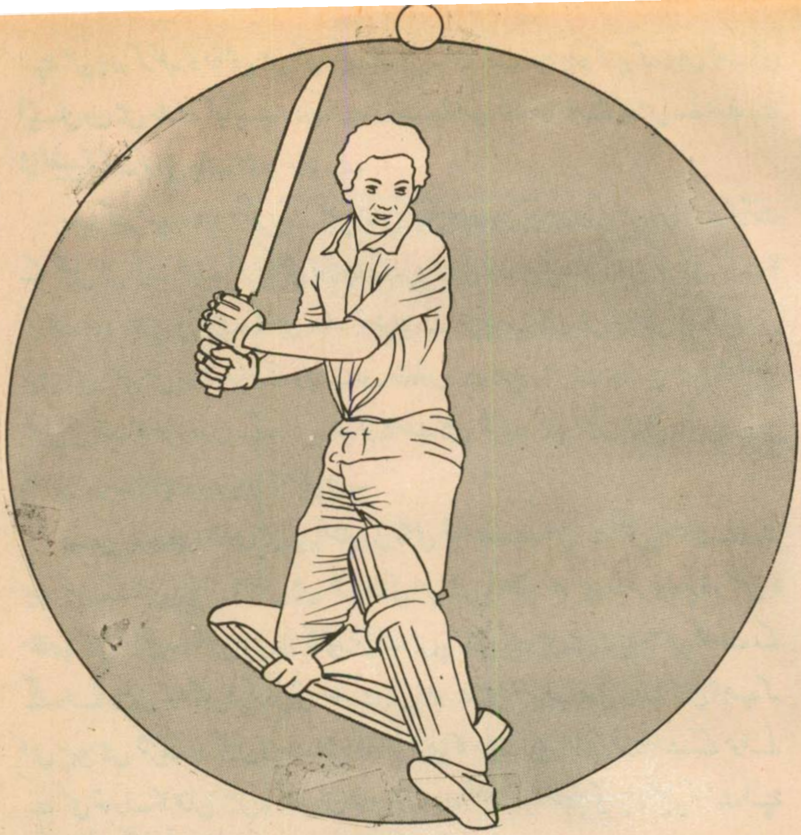

بینسن اینڈ ہیجز کپ

سیّد یحییٰ حسینی

ٹیسٹ کرکٹ کے مقابلے میں آج ہر شخص ون ڈے کرکٹ کے گن گاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ ایک دن کے ان مقابلوں میں دیکھنے والے کو ایک دن میں نہ صرف عمدہ بیٹنگ بلکہ اچھی بالنگ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پھر دیکھنے والے ایک ہی دن میں

اپنے من پسند کرکٹرز کو ایکشن میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں فیصلہ بھی ایک ہی دن میں سامنے آجاتا ہے۔ ون ڈے کرکٹ نے اب تک جو سفر طے کیا اس نے بہت سے شائقین کرکٹ کو اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے۔

سفید گیند' سیاہ سائیڈ اسکرین' رنگین لباس' برقی قمقموں کی موجودگی میں ون ڈے کرکٹ کے کھیل میں ایک طرف اگر دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوئی تو دوسری طرف اس طرز کی کرکٹ کا گراف مزید بلندی کی طرف گامزن ہوا۔ آسٹریلیا کے سرسبز میدانوں میں ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی دسمبر میں ورلڈ سیریز کے دلچسپ اور مقابلوں سے بھرپور معرکے ہمیشہ کی طرح شائقین کھیل کی توجہ کا مرکز ہوں گے۔ اس دفعہ ٹورنامنٹ میں شریک تین ٹیمیں سابق عالمی چیمپنز پاکستان' ویسٹ انڈیز اور میزبان آسٹریلیا ہیں۔

بینسن اینڈ ہیجز مقابلوں میں یہ پاکستان کی چھٹی شرکت ہے۔ اس سے قبل پاکستان نے ورلڈ سیریز کپ کے جن پانچ ٹورنامنٹس میں شرکت کی اس میں پاکستانی ٹیم کسی خاطر خواہ پرفارمنس کا مظاہرہ نہیں کرسکی۔ دیکھیں اس بار چھٹی شرکت میں پاکستانی ٹیم ماضی میں اپنے دامن شکست کے لگنے والے داغوں کو اچھی کارکردگی کی صورت میں دھونے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں؟ جب کہ اس سیریز میں شریک دو ٹیمیں ویسٹ انڈیز اور آسٹریلیا کا سابقہ ریکارڈ اس ٹورنامنٹ کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر آسٹریلیا کی یہ رنگین کرکٹ اپنے دلچسپ اور سنسنی خیز مقابلوں کی وجہ سے اس بار بھی دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز ہوگی۔

سب سے زیادہ مرتبہ فاتح ٹیم

اب تک منعقد ہونے والے سترہ ورلڈ سیریز کپ مقابلوں میں سب سے زیادہ مرتبہ فاتح بن کر سامنے آنے والی ٹیم میزبان آسٹریلیا کی ہے جس نے دس بار یہ اعزاز حاصل کیا۔ جبکہ آسٹریلیا کے علاوہ ویسٹ انڈیز کے حصے میں یہ اعزاز چھ اور انگلینڈ کے حصے میں ایک بار آیا۔

ایلن بارڈر ورلڈ سیریز کے کامیاب کپتان

آسٹریلیا نے دس ورلڈ سیریز کپ میں جیتنے کا اعزاز حاصل کیا اُن میں چھ بار ایلن بارڈر

کی سربراہی میں   یہ اعزاز حاصل کیا گیا۔

انفرادی سینچریاں

مجموعی طور پر اب تک 43 سینچریاں اسکور کی جا چکی ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ 20 آسٹریلیا کی طرف سے، 10 ویسٹ انڈیز کی طرف سے، 5 پاکستان کی طرف سے، 6 انگلینڈ کی طرف سے، جبکہ ایک ایک سنچری نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کی طرف سے بنی ہے۔

نروس نائنٹیز

ورلڈ سیریز مقابلوں میں اب تک 26 بیٹسمین نوے کے ہندسے کی ستم ظریفی کا شکار ہو چکے ہیں۔ جن میں بالترتیب آسٹریلیا کے 16، ویسٹ انڈیز کے 4، انگلینڈ کے 2، ساؤتھ افریقہ کے 2، جبکہ پاکستان اور بھارت کے ایک، ایک بیٹسمین اس فہرست کا حصہ ہیں۔

بینسن اینڈ ہیجز ورلڈ سیریز کپ 80 - 1979ء سے 96-1995ء کا ایک شماریاتی جائزہ

سیزن	ونر	رنرز	تیسرے نمبر پر آنے والی ٹیم
1979-80ء	ویسٹ انڈیز	انگلینڈ	آسٹریلیا
1980-81ء	آسٹریلیا	نیوزی لینڈ	بھارت
1981-82ء	ویسٹ انڈیز	آسٹریلیا	پاکستان
1982-83ء	آسٹریلیا	نیوزی لینڈ	انگلینڈ
1983-84ء	ویسٹ انڈیز	آسٹریلیا	پاکستان
1984-85ء	ویسٹ انڈیز	آسٹریلیا	سری لنکا
1985-86ء	آسٹریلیا	بھارت	نیوزی لینڈ
1986-87ء	انگلینڈ	آسٹریلیا	ویسٹ انڈیز

1987-88ء	آسٹریلیا	نیوزی لینڈ	سری لنکا
1988-89ء	ویسٹ انڈیز	آسٹریلیا	پاکستان
1989-90ء	آسٹریلیا	پاکستان	سری لنکا
1990-91ء	آسٹریلیا	نیوزی لینڈ	انگلینڈ
1991-92ء	آسٹریلیا	بھارت	ویسٹ انڈیز
1992-93ء	ویسٹ انڈیز	آسٹریلیا	پاکستان
1993-94ء	آسٹریلیا	جنوبی افریقہ	نیوزی لینڈ
1994-95ء	آسٹریلیا	آسٹریلیا "A"	انگلینڈ، زمبابوے
1995-96ء	آسٹریلیا	سری لنکا	ویسٹ انڈیز

1994-95ء میں ورلڈ سیریز کپ میں چوتھی ٹیم کی حیثیت سے پہلی بار آسٹریلیا "A" نے شرکت کی اور آٹھ میچ فائنل سمیت کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔ لیکن آئی سی سی نے آسٹریلیا "A" کے ان میچوں کو انٹرنیشنل میچوں کی حیثیت سے تصور نہیں کیا۔

ہر ملک کی کارکردگی:

ملک	میچز کھیلے	جیتے	ہارے	فیصلہ نہ ہوسکا	ٹائی	فتح کا تناسب
آسٹریلیا	186	112	68	4	2	60.22
ویسٹ انڈیز	95	59	33	1	2	62.12
انگلینڈ	44	20	23	1	-	45.45
نیوزی لینڈ	64	25	36	3	-	39.10
بھارت	32	11	20	-	1	35.93
پاکستان	46	13	31	1	1	28.30
جنوبی افریقہ	9	4	4	1	-	44.44

سری لنکا	36	7	29	-	-	19.44
زمبابوے	6	1	5	-	-	16.71
آسٹریلیا "A"	8	3	5	-	-	37.50

ہر ملک کا زیادہ سے زیادہ اسکور:

اسکور	ملک/بمقابلہ	بمقام	سیزن
2/523(50 اوورز)	آسٹریلیا/سری لنکا	ایڈیلیڈ	1984-85ء
3/315(50 اوورز)	پاکستان/سری لنکا	ایڈیلیڈ	1989-90ء
6/309(50' اوورز)	ویسٹ انڈیز/سری لنکا	پرتھ	1984-85ء
6/297(48.5' اوورز)	انگلینڈ/نیوزی لینڈ	ایڈیلیڈ	1982-83ء
8/288(50' اوورز)	سری لنکا/پاکستان	ایڈیلیڈ	1989-90ء
5/263(48' اوورز)	بھارت/نیوزی لینڈ	برسبین	1985-86ء
205(49.3' اوورز)	زمبابوے/انگلینڈ	پرتھ	1994-95ء
5/230(50' اوورز)	جنوبی افریقہ/آسٹریلیا	میلبورن	1993-94ء

ہر ملک کا کم از کم اسکور :

اسکور	ملک/بمقابلہ	بمقام	سیزن
63(25.5' اوورز)	بھارت/آسٹریلیا	سڈنی	1980-81ء
70(26.3' اوورز)	آسٹریلیا/نیوزی لینڈ	ایڈیلیڈ	1985-86ء
91(35.5 اوورز)	سری لنکا/آسٹریلیا	ایڈیلیڈ	1984-85ء
126(46.4 اوورز)	نیوزی لینڈ/آسٹریلیا	میلبورن	1980-81ء
139(42.5 اوورز)	انگلینڈ/ویسٹ انڈیز	ایڈیلیڈ	1979-80ء
69(28 اوورز)	جنوبی افریقہ/آسٹریلیا	سڈنی	1993-94ء

166/9(50 اوورز)	زمبابوے/ آسٹریلیا	پرتھ	1994-95ء
71(23.4 اوورز)	پاکستان/ویسٹ انڈیز	برسبین	1992-93ء
87(29.3 اوورز)	ویسٹ انڈیز/ آسٹریلیا	سڈنی	1992-93ء

ہر ملک کی جانب سے زیادہ سے زیادہ انفرادی اسکور:

158 ڈیوڈ گاور	انگلینڈ/ نیوزی لینڈ	برسبین	1982-83ء
153 ویوین رچرڈز	ویسٹ انڈیز/ آسٹریلیا	میلبورن	1979-80ء
138 گریک چیپل	آسٹریلیا/ نیوزی لینڈ	سڈنی	1980-81ء
126 سعید انور	پاکستان/ سری لنکا	ایڈیلیڈ	1989-90ء
102 بروس ایڈگر	نیوزی لینڈ/ آسٹریلیا	میلبورن	1980-81ء
112 گیری کرسٹین	جنوبی افریقہ/ آسٹریلیا	میلبورن	1993-94ء
92 سنیل گواسکر	بھارت/ آسٹریلیا	سڈنی	1985-86ء
88 اسانکا گروسنہا	سری لنکا/پاکستان	برسبین	1989-90ء
84 گرانٹ فلاور	زمبابوے/ انگلینڈ	پرتھ	1994-95ء

ہر ملک کی جانب سے بہترین بالنگ:

5/15- گریگ چیپل	آسٹریلیا/ بھارت	سڈنی	1980-81ء
5/15- روی شاستری	بھارت/ آسٹریلیا	پرتھ	1991-92ء
5/26- رچرڈ ہیڈلی	نیوزی لینڈ/ آسٹریلیا	سڈنی	1980-81ء
5/25- ایان بشپ	ویسٹ انڈیز/پاکستان	برسبین	1992-93ء
5/53- عبدالقادر	پاکستان/ ویسٹ انڈیز	میلبورن	1983-84ء
5/٤٥- رچرڈ اسنیل	جنوبی افریقہ/ آسٹریلیا	میلبورن	1993-94ء
3/15- گرانٹ فلاور	زمبابوے/ آسٹریلیا	پرتھ	1994-95ء
4/37- روی رتنائیکے	سری لنکا/ آسٹریلیا	میلبورن	1984-85ء

آنکھ مچولی

تحریری مباحثہ

شرکت کی آخری تاریخ: ۱۰ دسمبر ۱۹۹۶ء

اِس ایوان کی رائے میں

لڑکیاں بہتر پاکستانی ہیں

لڑکیاں کہتی ہیں	لڑکے کہتے ہیں
ہم زیادہ قابل، محنتی اور ذمّے دار ہیں	اِس مُلک کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں ہے۔
امتحانوں میں اکثر پوزیشنیں ہم لیتے ہیں	دفاتر اور کارخانے ہمارے دم سے ہیں۔
والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری ہم کرتے ہیں	ترقی کا پہیہ ہماری وجہ سے گھوم رہا ہے۔
پاکستان کی عزت ہمارے دم سے ہے	ہم محنتی اور سخت کوش ہیں۔
اور یہ لڑکے نکھٹو... کام کے نہ کاج کے دُشمن اناج کے	لڑکیاں بے چاری تو گھرداری کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتیں۔

آپ کیا کہتے ہیں؟

اپنا مؤقف صاف صاف لکھیے، فیصلہ بہتر مؤقف اور مضبوط دلائل کی روشنی میں ہوگا

منصف ہیں معروف مقررہ | خوش بخت شجاعت

آپ کے لیے تین بہترین انعام ہیں

نتائج مقابلہ نمبر جنوری ۱۹۹۷ء میں دیکھیے

اپنا وطن پھر اپنا وطن ہے

مرسلہ : عارف محمود قریشی، جھنگ

پنجابی زبان کے نامور شاعر استاد دامن لال قلعہ دہلی والے مشاعرے میں خصوصی دعوت پر شریک ہوئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم تھے۔ ان کو استاد دامن کی آمد کا پتہ چلا تو بھاگم بھاگ مشاعرہ گاہ پہنچے۔ لیکن شعراء کی نظروں سے اوجھل ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اس مشاعرے کی صدارت بھارت کے صدر، راجندر پرشاد کر رہے تھے۔

استاد نے اپنی نظم "ونڈ" (تقسیم) شروع کی اور جب اس شعر پر پہنچے

لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے روئے تسی وی او، روئے اساں وی آں

(آنکھوں کی سرخی یہ بتا رہی ہے کہ تم بھی رو چکے ہو اور ہم نے بھی آنسو بہائے ہیں)

تو نہرو کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ بھاگتا ہوا اسٹیج پر پہنچا اور استاد دامن سے بغل گیر ہو گیا۔ گریہ سے اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ کافی دیر تک وہ اشک بہاتا رہا۔ حالت زار پر قابو پایا تو اس نے استاد سے درخواست کی۔ "استاد! میری اور سارے ہند کی پرجا کی التجا ہے کہ آپ ہندوستان آجائیں ہر ممکن سہولت مہیا کرنے کا میں وعدہ کرتا ہوں۔" پنڈت جی کے ہونٹ اس وقت لرز رہے تھے۔

"پنڈت جی!" استاد نے اپنے آپ کو ان کی بانہوں کے حلقے سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ناممکن ہے اب پاکستان بن گیا ہے اور میرا مرنا جینا اب اسی ملک کے ساتھ ہے۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ مگر میں رہوں گا اپنے پاکستان میں خواہ مجھے جیل میں رہنا پڑے۔" استاد نے اپنے ان جذبات کو اپنے اشعار میں اس طرح ظاہر کیا۔

میرے ہنجواں دا پانی پی پی کے ہری بھری ایہہ بنجر زمین ہووے

ایہدے چہرے اتے سرخی چاہیدی اے میرے خون تھیں بھانویں رنگین ہووے

ا۔ میرے آنسوؤں سے سیراب ہو کر یہ بنجر زمین سرسبز ہو جائے۔

۲۔ مجھے تو اس کے چہرے کی سرخی درکار ہے خواہ وہ سرخی میرے خون سے آئے

موڑن طالب علم

فرقان وھاب کی نظر میں

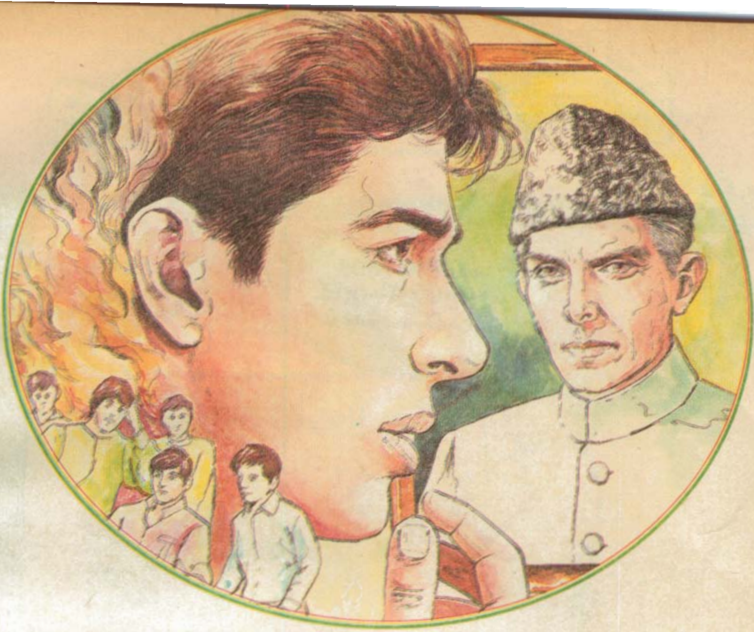

جب وہ قائداعظم بنے

عبدالستار خان طاہر

یہ یقیناً" محمد علی جناح ہی تھے۔ جن کی شبانہ روز کوششوں سے یہ ملک حاصل ہوا اور آپ کے اسی عظیم کارنامے سے مسلم قوم نے آپ کو "قائداعظم" کا لقب دیا اور یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ اب بچے بچے کی زبان پر "قائداعظم ہے اور دنیا محمد علی جناح سے زیادہ "قائداعظم" کے لقب سے آپ کو جانتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ محمد علی جناح کو قائداعظم کا خطاب سب سے پہلے کس شخص نے دیا تو یہ تاریخی حقیقت ہم آپ کو مختلف تاریخی حوالوں سے بتاتے ہیں۔

اس کے بارے میں

مختلف روائتیں ہیں جن کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ مرکز قانون ساز اسمبلی کے اجلاس نومبر ۱۹۲۳ء میں انہوں نے کہا۔ "میرا کوئی ارادہ نہیں کہ میں حکومت میں کوئی عہدہ یا اعزاز حاصل کروں۔ میں تو صرف اور صرف اپنے ملک کی

خدمت بہترین انداز میں کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔"

جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے انہیں ۱۹۴۲ء میں لکھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں "ڈاکٹر آف لاء" کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ خود کوئی تاریخ مقرر کریں کہ اس کے لئے تقریب کا انعقاد کیا جاسکے تو قائداعظم نے کمال بے نیازی سے انہیں لکھا کہ "وہ یونیورسٹی کے ممنون ہیں۔ لیکن وہ یہ اعزاز قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں کیوں کہ وہ ہمیشہ مسٹر ایم۔ اے جناح کی حیثیت سے رہے ہیں اور وہ اسی حیثیت میں رہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ وہ ہر طرح کے خطابات اور القابات کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کے بغیر اپنے آپ کو زیادہ مسرور اور آزاد تصور کرتے ہیں۔"

یہ بات دل چسپ ہے کہ لوگوں نے جب انہیں "شہنشاہ پاکستان" کہا تو انہوں نے برا منایا اور سختی سے ان کو ڈانٹ دیا۔ جب مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں انہیں تاحیات مسلم لیگ کا صدر بنانے کی تجویز پیش کی گئی تو انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اسے جمہوری عمل کے منافی قرار دیا۔ مگر انہیں قوم کی طرف سے دیئے گئے اس خطاب یعنی "قائداعظم" پر کبھی اعتراض نہ ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ قومیں اظہار تشکر اور احترام کے لئے اپنے عظیم رہنماؤں کو خطاب دیا ہی کرتی ہیں۔

دہلی سے ایک سہ روزہ اخبار "الامان" کے نام سے نکلا کرتا تھا۔ اس کے مدیر "مولانا مظہر الدین شیرکوٹی تھے۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل کی بات ہے جب انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے ذہن اور جذبات کو سامنے رکھتے ہوئے محمد علی جناح کے لئے "قائداعظم" کا خطاب تجویز کیا۔ یہ خطاب پہلی بار سہ روزہ اخبار "الامان" دہلی میں ہی شائع ہوا۔ یوں آہستہ آہستہ یہ خطاب سب مسلمانوں کی زبان پر آگیا۔

مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی خود نوشت "سرگزشت" میں لکھا ہے کہ "قائداعظم" کا خطاب سب سے پہلے دہلی کے اخبار "الامان" میں شائع ہوا تھا۔ لاہور میں تحریک خلافت کے ایک پرجوش رکن میاں فیروز الدین احمد ہوا کرتے تھے۔ انہیں محمد علی جناح سے بڑی عقیدت تھی۔ جب کہیں جلسہ ہوتا وہ "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ اس سے یہ لقب اور خطاب پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ ملا واحدی مرحوم جو "دہلی سے

خوب واقف" تھے اور خواجہ حسن نظامی کے عزیز دوست اور سوانح نگار بھی تھے ان کا بیان ہے کہ یہ خواجہ حسن نظامی تھے جنھوں نے ایک عام جلسے میں تقریر کے دوران محمد علی جناح کو "قائداعظم" کا خطاب دیا تھا۔ اور یہ تقریر سہ روزہ اخبار "الامان" میں بھی شائع ہوئی تھی اور وہیں سے "الامان" کے مدیر نے یہ خطاب لیا تھا۔ وہ لوگ جو خواجہ حسن نظامی سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی کو واقعی خطابات اور القابات دینے کی عادت تھی۔ اس سلسلے میں وہ خصوصی شہرت رکھتے تھے ان کے دیئے ہوئے القابات اور خطابات واقعی مشہور اور زبان زد عام ہوئے ہیں۔ مثلاً" خواجہ حسن نظامی نے ہی مولانا راشد الخیری کو "مصور غم" کا خطاب دیا تھا اور یہ بھی خواجہ حسن نظامی ہی تھے جنھوں نے "حکیم اجمل خان" کو "مسیح الملک" کا خطاب دیا تھا۔ جو پورے ملک میں مشہور ہوا۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت یہ ہے جو محمد امین زبیری بیان کرتے ہیں۔ مولانا احمد سعید جو جمعیت العلمائے ہند کے رہنما تھے۔ انہوں نے ۷ دسمبر ۱۹۳۶ء کو مراد آباد کی جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "مسلمانوں میں اور کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو مسٹر جناح سے زیادہ سیاست کو جانتا ہو اور سمجھتا ہو۔ اس لئے وہ صحیح معنوں میں اس کے حق دار ہیں کہ انہیں مسلمانوں کا "قائداعظم" قرار دیا جائے۔"

شریف المجاہد نے "جناح اینڈ مسلم پالیٹکس" (Jinnah And Muslim Politics) میں اس روایت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جناب محمد امین زبیری کے اس بیان کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس زمانے میں جمعیت العلمائے ہند مسلم لیگ کی مخالف نہ تھی اور یہ جمعیت العلمائے ہند ہی تھی جس نے اپریل سن ۱۹۳۶ء میں محمد علی جناح کو اپنے اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دی تھی۔ پھر سن ۱۹۳۶ء کے زمانے میں کمیونل ایوارڈ کے بارے میں کانگریس نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اس سے جمعیت العلمائے ہند والے خاصے پریشان تھے اور غیر مطمئن تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سن ۱۹۳۶ء۔۔ ۱۹۳۷ء میں جو انتخاب ہوئے ان میں جمعیت العلمائے ہند نے مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت کی تھی۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں جمعیت العلمائے ہند کے رہنماؤں نے دورے بھی کئے تھے۔ جناب محمد امین زبیری، مولانا احمد سعید کی جس تقریر کا ذکر کرتے ہیں، وہ

تقریر بھی انتخابی دورے کا ایک حصہ تھی۔ اس لئے اس روایت کو تسلیم کرلینا چاہئے۔ بہرحال یہ مولانا احمد سعید تھے جنہوں نے پہلی بار محمد جناح کے لئے "قائداعظم" کا لقب تجویز کیا تھا' یا خواجہ حسن نظامی۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ سہ روزہ اخبار "الامان" دہلی پہلا اخبار تھا۔ جس نے محمد علی جناح کے نام کے ساتھ پہلی بار "قائداعظم" کا لقب شائع کیا۔ اس کے بعد یہ میاں فیروز الدین احمد تھے۔ جنہوں نے جلسوں میں "قائداعظم زندہ باد" کے نعروں کو مقبول بنایا۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ گاندھی نے جو برصغیر کی سیاست میں قائداعظم محمد علی جناح کے سب سے بڑے حریف تھے۔ محمد علی جناح کو فی الفور "قائداعظم" تسلیم کرلیا ہوا یوں کہ جب صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کا خاتمہ ہوا اور قائداعظم کے اعلان پر پورے ملک میں یوم نجات منایا گیا تو گاندھی کو گلبرگہ کے مسلمانوں کی طرف سے ایک تار ملا جس میں لکھا گیا تھا۔ "یوم نجات کی مبارک باد قائداعظم زندہ باد"

گاندھی نے اس تار کے حوالے سے اپنے اخبار "ہریجن" (جنوری ۱۹۴۰ء) میں ایک مضمون میں لکھا تھا۔ "یہ تار مجھے اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس طرح میرے جذبات مجروح اور مشتعل ہوں گے مگر تار بھیجنے والوں کو یہ مطلق علم نہ ہوسکا کہ انہوں نے جس مقصد کے لئے یہ تار بھیجا تھا۔ اس میں انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ جب یہ تار مجھے ملا تو میں بھی تار بھیجنے والوں کی امنگوں اور خواہشوں میں شامل ہوگیا۔ "قائداعظم زندہ باد" قائداعظم ہمارے ایک پرانے ساتھی ہیں۔" ۱۶ جنوری سن ۱۹۴۰ء کو گاندھی نے اپنے اس مضمون کی ایک نقل قائداعظم کو ایک خط کے ساتھ بھیجی۔ خط ملاحظہ ہو۔

۱۶جنوری سن ۱۹۴۰ء
ڈیَر قائداعظم!

"کسی ہندوستانی کے نام کے ساتھ مسٹر لکھنے سے مجھے نفرت ہے۔ یہ کچھ غیر فطری سا لگتا ہے۔ اس سے پہلے میں آپ کو جناح یا جناح صاحب لکھتا رہا ہوں۔ کیونکہ مرحوم حکیم صاحب (حکیم اجمل خاں) نے مجھے ایسے ہی بتایا تھا مگر ابو الکلام آزاد نے مجھے بتایا ہے کہ مسلم لیگ کے حلقوں میں آپ کو ہمیشہ قائداعظم کہا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ منسلک ٹیلی گرام سے بھی جو مجھے گل برگہ سے موصول ہوا ہے'

آپ پر واضح ہوگا کہ اس کے اختتام میں یہی لکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ خلوص نیت سے کیا ہے۔ آپ بھی مجھے دوسرے انداز میں خطاب کریں گے تو اس سے مجھے خوشی ہوگی۔ بہ ہرحال میں آپ کی خواہشات کا احترام کرتا رہوں گا۔ اس خط کے لکھنے کا مقصد اخبار "ہریجن" میں چھپنے والے اپنے مضمون کی پیشگی نقل آپ کو پہنچانا ہے۔ جسے میں چھپنے کے لئے بھیج چکا ہوں۔

آپ کا مخلص

ایم۔کے۔گاندھی

مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان گاندھی کی تحریر سے انحراف کرتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سلسلے میں جو لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بعض معاملات میں وہ بہت تنگ نظر تھے۔ انہیں یہ پسند نہ تھا کہ محمد علی جناح کو "قائداعظم" کا خطاب دیا جائے۔ وہ محمد علی جناح کو اس خطاب کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ گاندھی اپنے خط میں مولانا ابولکلام آزاد کا حوالہ دیتے ہیں لیکن مولانا ابوالکلام آزاد اس سے سرے سے ہی منکر ہوجاتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اپنی کتاب (India Wins Freedom) میں لکھتے ہیں۔ "یہ گاندھی جی ہی تھے جنھوں نے پہلی دفعہ قائداعظم کے خطاب کو شہرت بخشی۔ اس کا مطلب ہے۔ "عظیم رہنما" جو مسٹر جناح سے منسوب ہوا۔ گاندھی جی کے کیمپ میں ایک سادہ لیکن باخبر خاتون "مس امتہ الاسلام" کے نام سے رہتی تھیں۔ اسی خاتون نے کچھ اردو اخباروں میں پڑھا تھا کہ مسٹر جناح کو "قائداعظم" لکھا جاتا ہے۔ جب گاندھی جی مسٹر جناح سے ملاقات کے لئے ایک بار خط لکھنے لگے تو اس خاتون نے گاندھی جی کو بتایا کہ اردو اخباروں میں مسٹر جناح کو "قائداعظم" لکھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ بھی خط میں انہیں اسی لقب سے خطاب کریں۔ گاندھی جی نے بلا ہچکچاہٹ اپنے اس عمل کے نتائج پر غور کیئے بغیر خط میں یہی استعمال کردیا۔ جلد ہی یہ خط اخباروں میں شائع ہوگیا۔ جب ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا کہ خود گاندھی مسٹر جناح کو "قائداعظم" کے لقب سے خطاب کررہے ہیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ واقعی مسٹر جناح ایسے ہی ہوں گے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو وضاحت پیش کی ہے۔ وہ کمزور بنیادوں پر کھڑی ہے اور اس وضاحت سے ہی صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ مولانا

ابوالکلام آزاد ایک تو غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ انہیں مطلق پسند نہ تھا کہ محمد علی جناح کو "قائداعظم" کا خطاب دیا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایک سادہ لوح خاتون اور گاندھی جی کی جلد بازی کی وجہ سے محمد علی جناح کو "قائداعظم" کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوگئی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ گاندھی محمد علی جناح کو ایک ایسا خط لکھوا رہے تھے۔ جس میں ان سے ملاقات طے کرنے کا مسئلہ تھا۔ حالانکہ گاندھی کا وہ خط جس میں انہوں نے پہلی بار "قائداعظم" سے خطاب کیا۔ یوم نجات اور گل برگہ سے آنے والے ٹیلی گرام سے متعلق تھا اور اس کا مقصد گاندھی کے اخبار میں چھپنے والے گاندھی کے ایک مضمون کی پیشگی نقل بھجوانا تھا جو گاندھی نے لکھا تھا۔ بہرحال گاندھی نے محمد علی جناح کو "قائداعظم" تسلیم کرلیا تھا۔

7 مارچ ۱۹۴۳ء کو جب آل انڈیا مسلم لیگ کا انتخاب ہوا تو پہلی بار مسلم لیگ کے ریزولیوشن میں ان کے نام کے ساتھ قائداعظم لکھا گیا اور پھر مسلم لیگ کی دستاویزات میں انہیں "قائداعظم" ہی کے لقب سے خطاب کیا گیا۔ ۱۲

اقوال زریں

یاسر بن نثار۔ راولپنڈی

(۱) وہ گھر جس میں کتابیں نہ ہوں اس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو۔

امیر خسروؒ۔

(۲) نادان بھی اس نتیجے پر پہنچتا ہے جس پر دانا، مگر بڑی خرابی کے بعد۔

شیخ سعدیؒ۔

(۳) اگر چڑیاں متحد ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔

شیخ سعدیؒ۔

(۴) عقلمند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔

سقراط۔

(۵) قناعت وہ سرمایہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

حضرت فاطمہؓ۔

اگست ۷ ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں یہ طے پایا کہ آئندہ سے مسٹر محمد علی جناح کو تمام عمال اور سرکاری دستاویزات میں "قائداعظم" لکھا جائے۔ اس طرح محمد علی جناح پاکستان اور پاکستانیوں میں ہمیشہ کے لئے قائداعظم کی حیثیت اختیار کر گئے۔ قائداعظم زندہ باد۔

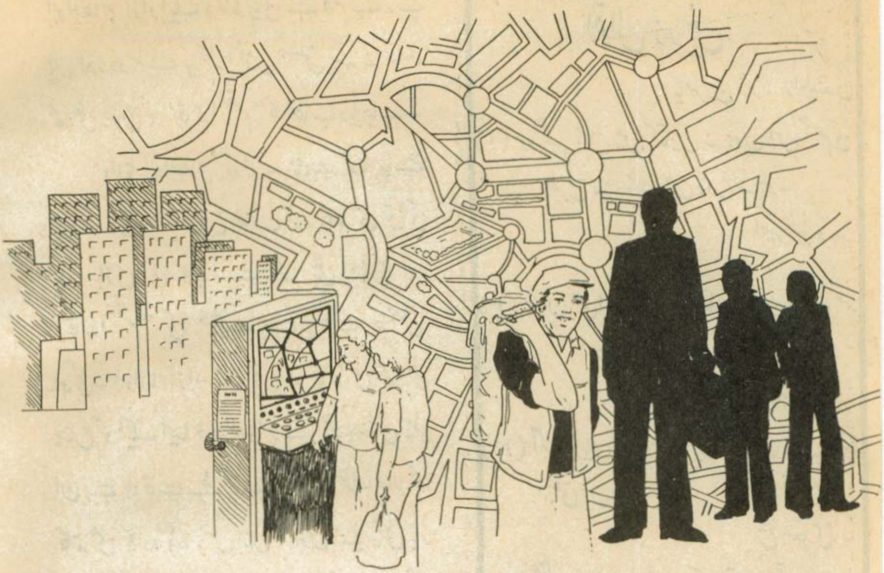

زندگی کی حقیقت

زر تاج شامی، کراچی

بتائے کوئی مجھ کو دنیا ہے کیا
یہ لگتی ہے مجھ کو کھلونا نما
کھلونا ہیں انسان، چابی بھرے
ہوئے ختم جب سانس پورا کیا
ہے منزل کی جانب سفر رات دن
تری زندگی کیا ہے اس کے سوا
یہ گاڑی چلی اور پھر رُک گئی
پہیے سے نکلی ہے جوں ہی ہوا
میں کہنے کو ہوں ایک ذرّہ مگر
نہیں میری تخلیق بے مدّعا
ہر اک شخص کا ہے یہاں امتحاں
نتیجہ سنائے گا سب کا، خدا

سونے کے ہاتھ

غلام مصطفیٰ سولنگی

یہ کوئی دو ڈھائی سو برس پہلے کی بات ہے۔ ملک روس کے کسی قصبے میں ایک بہت ہی مالدار تاجر رہتا تھا۔ جس کی میفتک نامی ایک بہت خوبصورت بیٹی تھی۔ وہ جب بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر سیر کو جاتی تو لوگ اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے گلیوں اور سڑکوں پر نکل آتے' ستاروں کی روشنی ماند پڑجاتی' کیوں کہ اس کی آنکھیں بہت ہی چمکدار تھیں اور ندیاں بہتے بہتے رک جاتیں کیوں کہ اس کی آواز ندیوں کے رسیلے گیتوں سے بھی زیادہ میٹھی اور رسیلی تھی۔

میفتک کا باپ اس کو بہت زیادہ پیار کرتا تھا اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ جب وہ بڑی ہوئی تو اسے اپنی بیٹی کو بیاہنے کی فکر لگی۔ ایک رات وہ اس کے کمرے میں چلا گیا اور پوچھا : "بیٹی! اب تم بڑی ہوگئی ہو' اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تمہاری

شادی کر کے اپنا بوجھ ہلکا کروں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ہاں بابا جان! میں شادی کروں گی، لیکن اگر میری ایک خواہش پوری ہو جائے تو....."

"کون سی خواہش بیٹی؟ میں نے تمہاری ہر خواہش پوری کی ہے، اب بھی جیسا کہو گی، ویسا ہی کروں گا۔"

"بابا جان! میں اس نوجوان سے شادی کروں گی جو امیر بھی ہو اور غریب بھی۔" یہ سن کر تاجر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور پھر کہنے لگا :

"مگر بیٹی میں تمہارے لئے ایسا شوہر کہاں سے ڈھونڈوں گا......؟ یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

"بابا جان! آپ فکر نہ کریں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ بس صرف ایک اعلان کروا دیں۔ پھر جن کو میرے ساتھ شادی کرنی ہو گی، وہ خود ہی ہمارے ہاں چلے آئیں گے۔"

باپ کو بیٹی کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے اعلان کر دیا کہ "میں اپنی بیٹی کی شادی اس نوجوان سے کروں گا جو یہ ثابت کر دکھائے گا کہ وہ امیر بھی ہے اور غریب بھی ہے۔" ایک تاریخ مقرر کی گئی، جس پر شادی کے امیدواروں کو آنا تھا۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا۔ صبح صبح میفتک کی سہیلیاں اسے بنانے سنوارنے کے لئے اس کے گھر پہنچ گئیں۔ کوئی اس کے بال سنوارنے لگی تو کوئی اسے زربفت کے کپڑے پہنانے لگی اور کسی نے اس کی نرم و نازک انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنائیں۔ مطلب یہ کہ اسے دلہن سے بھی زیادہ سنوارا گیا۔

پھر ایک نوکر نے آکر میفتک کے والد کو بتایا کہ کافی امیدوار گھر کے باہر موجود ہیں۔ میفتک کی کچھ سہیلیاں باہر جا کر ان امیدواروں کو دیکھ آئیں۔ ایک نے بتایا : "ایک نوجوان تو ایک سو اونٹ لے آیا ہے اور ان سارے اونٹوں پر قیمتی جواہرات کی بوریاں لدی ہوئی ہیں۔"

دوسری نے بتایا "ایک نوجوان تو اپنے ایک ہزار جنگجو نوجوانوں کو لے آیا ہے جن کے پاس کافی ہتھیار بھی ہیں۔"

"اور ایک نوجوان تو سونے سے بھری ہوئی صندوقیں لے آیا ہے۔" تیسری لڑکی نے بتایا "ہاں، وہ لے تو بہت کچھ آئے ہوں گے لیکن باہر چل کر دیکھا جائے تو وہ ہیں کیسے......؟"

باپ اندر آیا، "بیٹی! تم اگر تیار ہو گئی ہو تو پھر باہر چلیں۔ کافی نوجوان انتظار کر رہے ہیں۔"

"ہاں بابا جان! میں باہر چلنے کو تیار ہوں۔"
پھر وہ سب۔ لوگ باہر آ گئے۔

سارے امیدواروں نے میفتک اور اس کے والد کو جھک کر سلام کیا۔ پھر وہ قریب ہی رکھی ہوئی پتھر کی بینچ پر اپنے والد کے ساتھ بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد میفتک کے والد اٹھے اور سارے امیدواروں کو مخاطب کر کے کہا، "میں اپنی بیٹی کی شادی اس نوجوان سے کر دوں گا جو غریب بھی ہو اور امیر بھی۔ اب آپ لوگ باری باری اپنے بارے میں کچھ بتاتے جائیں۔"

ایک خوبصورت نوجوان آگے بڑھا۔ اس کے نوکروں نے قیمتی جواہرات سے لدے ہوئے اونٹوں کو بھی اس کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ اس نوجوان نے میفتک کو سلام کیا اور کہا، "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ سارے قیمتی جواہرات تمہارے لئے ہی لایا ہوں۔"

"تم تو کافی مالدار دکھائی دے رہے ہو؟" میفتک بولی۔

"ہاں میں کافی مالدار ہوں۔ ان کے علاوہ میرے گھر میں بھی کافی جواہرات موجود ہیں۔ میں تمہیں اور بھی بہت کچھ دے سکتا ہوں۔"

"اگر تم اتنے مالدار ہو تو پھر اپنے آپ کو غریب کیوں سمجھتے ہو......؟؟"

"ایک بہت بڑے خزانے کے نہ ہونے کی وجہ سے میں غریب ہوں۔ اور وہ خزانہ تم ہو۔"

میفتک شرما گئی، اور بولی، "اگر میں خزانہ ہوں تو پھر تم مجھے حاصل کر کے اور بھی زیادہ امیر ہو جاؤ گے اس لئے میں تمہیں قبول نہیں کرتی۔"

پھر دوسرا نوجوان اپنے جنگجو لشکر کے ساتھ آگے آیا۔ سلام کے بعد اس نے کہا "میں اگرچہ امیر تو نہیں ہوں لیکن ان نوجوانوں کی مدد سے کئی ملکوں پر قبضہ کر کے بہت بڑا مالدار بن سکتا ہوں۔"

"لیکن تم بذات خود کیا کر سکتے ہو......؟" میفتک نے پوچھا۔

"میں ان نوجوانوں کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔" جواب ملا۔

"اگر تم ان کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے ہو تو پھر مجھ سے کیوں شادی کرنے آئے ہو......؟"

نوجوان شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے بعد ایک بہت ہی سیدھا سادا میلے کپڑوں میں ملبوس نوجوان آگے بڑھا اور میفتک کو بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا۔

"کیا تم بھی میری بیٹی سے شادی کرنے آئے

بات ہے پتے کی

زندگی کی گاڑی کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ دل کے بریکوں پر مکمل کنٹرول رکھیں۔ زبان میں سپیڈو میٹر کی سوئی لگائیں، بازوؤں میں محنت کی ٹیوب اور پاؤں میں استقامت کے ٹائر استعمال کریں تاکہ حوادثِ زمانہ آپ کی گاڑی کو پنکچر نہ کر سکے، آنکھوں کی ہیڈلائٹس خوبصورت اور چمکدار چہروں پہ نہ ڈالیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو دکھائی ہی نہ دے اور آپ کی گاڑی حادثہ کا شکار ہو جائے۔ خلوص و ایثار کے گیٹ پر کنڈیکٹر یا سیکریٹری رکھنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ رش میں چلتے ہوئے زیادہ گیئر نہ بدلیں۔ انجن کو گرم ہونے سے بچانے کے لئے غصہ کا واٹر پیتے رہیں۔ زندگی کی گاڑی کو خوبصورت بنانے کے لئے پر خلوص دوستوں کا پینٹ کریں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے پاس خوش اخلاقی کا لائسنس ضرور رکھیں۔

مرسلہ عنبرین عشرت، کراچی

ہو.....؟" میفتک کے باپ نے طنزیہ انداز میں کہا' "اچھا! تم غریب تو ہو لیکن تمہاری دولت کہاں ہے؟"

"محترم! میں ایک غریب نوجوان ہوں اور میرے پاس جو دولت ہے وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔" اس غریب نوجوان نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

پھر نوجوان نے اپنے تھیلے میں سے سوئی دھاگہ' کیلیں اور چمڑا ہتھوڑا اور چمچ اور دیگچی نکال کر میفتک کے سامنے رکھیں اور بولنا شروع کیا :

"میں ایک تجربہ کار درزی ہوں۔ اور میفتک نے جو لباس پہنا ہوا ہے اس سے زیادہ خوبصورت لباس سی سکتا ہوں۔ مجھے بہت خوبصورت اور پائیدار جوتے بھی بنانے آتے ہیں۔ میں بہت خوبصورت زیورات بھی بنا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کھانا بھی پکانا آتا ہے۔ اتنا مزیدار کہ اب تک دنیا کے کسی بادشاہ نے چکھا تک نہ ہو گا۔"

"مجھے اپنا شوہر مل گیا۔" میفتک پکار اٹھی۔ سب لوگ حیران ہوگئے۔ پھر اس نے اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : "بابا جان! یہ نوجوان ہی مجھے پسند ہے اور میں اس سے ہی شادی کروں گی۔ اس کے یہ ہاتھ جو بہت کچھ کرنا جانتے ہیں وہ سونے' چاندی اور جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ درحقیقت یہ ہاتھ سونے کے ہاتھ ہیں۔"

اور پھر اس خوبصورت لڑکی کی شادی سونے کے ہاتھوں والے اس غریب نوجوان سے کر دی گئی۔

ایک لاکھ کی گیند

عبدالرحمٰن غوری

آپ کو معلوم ہے میں ایک بہت پرانا بلکہ ریٹائرڈ کرکٹر ہوں اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے ایک ہزار رنز بنائے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمارے شہر میں ایک ٹورنامنٹ ہو رہا تھا اور اس ٹورنامنٹ کا آخری یعنی فائنل میچ ہو رہا تھا۔ ہماری ٹیم کی باری تھی اور بیٹنگ میری تھی۔ اس وقت میں نے (۹۵۰) رنز بنائے تھے اور کہیں سے لوگوں نے سن لیا کہ جس گیند سے میں ایک ہزار رنز مکمل کروں گا وہ گیند عجائب گھر والے ایک لاکھ روپے میں خریدیں گے۔ صبح ہی سے پورے شہر کی آبادی میدان میں آئی ہوئی تھی اور میں تھا کہ چوکے پہ چوکے لگائے جا رہا تھا اور میرا یہ ریکارڈ ہے کہ میں نے کبھی دوڑ کر رنز نہیں بنائے بلکہ صرف چوکوں اور چھکوں کی مدد سے بنائے ہیں۔ تو جناب اسکور بڑھ رہا تھا۔ ۹۸۲، ۹۸۶، ۹۹۰، ۹۹۴ بالر

صاحب دوڑتے ہوئے آئے، ہمیں گیند کرائی اور ہم نے بلے (بیٹ) کی مدد سے گیند کو نیلے آسمان کی طرف اڑا دیا۔

بس پھر کیا تھا آپ شائد سوچ رہے ہوں گے کہ تماشائیوں نے نعرہ مارا ہو گا کہ ایک ہزار رنز پورے ہو گئے مگر نہیں، انہوں نے نعرہ مارا .....! "چل بھئی دوڑ!!!" پھر کیا تھا آگے آگے ہمارے ایمپائر بھائی بھلکڑ اس کے پیچھے ہم اور ہمارے پیچھے پورا شہر.......!! اچانک ایمپائر کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر پڑا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گئے۔ ان کا کوٹ لالہ جی کے قدموں میں الجھ گیا اور وہ بھی گر گئے لالہ جی کی عینک اچھل کر خان صاحب کے پیٹ پر لگی۔ خان صاحب کے ہاتھ میں جوشاندے کی پڑیا تھی وہ اچھل کر ہمارے چچا کے منہ پر لگی تو وہ بھنا کر بولے "یہ کس ہوٹل والے نے مذاق کیا ہے۔" چچا جان کے اس جملے پر چودھری صاحب نے ہنسنے کے لئے جونہی پیٹ پکڑا تو وہ بھول گئے کہ سبزی والے کا موٹا سا پیٹ ان کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ سبزی والا گھبرا کر رک گیا۔ وہ رک کر اور پھر دوڑتے ہوئے چلانے لگا۔ .... "یہ بے ایمانی ہے۔" گیند ہوا میں اڑ رہی تھی اور ہم دوڑ رہے تھے۔

راستے میں ایک بارات جا رہی تھی آگے آگے بینڈ باجے والے تھے اور پیچھے گھوڑے پر سوار دولہا میاں۔ دولہا میاں نے جب یہ سنا کہ گیند ایک لاکھ روپے کی ہے تو انہوں نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ آگے بڑھے تو دیکھا کہ ہائی اسکول کی چھٹی ہو رہی تھی اسکول کے لڑکے بھی ہمارے ساتھ دوڑنے لگے۔ جامع مسجد کی گلی میں پہنچے تو ایک چندہ مانگنے والی جماعت بھی ہمارے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ اور سودا سلف بیچنے والے بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ایک پان والا راستے میں پان بنا کر پیسے بٹور رہا تھا۔ ایک چائے والا چائے گرم کر کے دے رہا تھا کہ اچانک گیند کی رفتار سست پڑ گئی۔ اور لوگ اور تیز دوڑنے لگے۔ ایک ایمپائر جو مجھ سے پیچھے تھا مجھ سے آگے نکل گیا اور گیند دریا کے پل پر گر گئی۔ گیند نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور آگے کی طرف چلتی ہوئی دائیں طرف مڑی اور دریا میں غڑاپ سے گر گئی۔ اور ایمپائر ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا اور فضا میں دونوں ہاتھ بلند کئے اور معلوم سی صورت بنا کر کہا۔ "چھکا" ......

قصّہ کوئز 4

سلیم مُغل

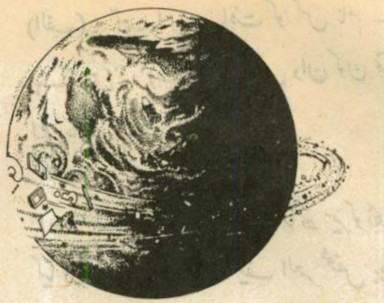

دلوں میں اتر جانے والے اور ذہن کو متاثر کرنے والے قصّے، جذبوں میں نئی روح پھونک دینے والے حقائق اور عزم کو نئی مہمیز عطا کرنے والے واقعات کی تاریخ سے چند واقعات آپ کے مطالعے کے لئے حاضر ہیں۔ ہر واقعے کے اختتام پر دو سوال سر اٹھاتے ہیں۔ گویا دس سوالوں کے جواب آپ کو دینا ہیں۔ بہت سے انعامات آپ کے منتظر ہیں۔ جواب کے ساتھ کوپن کا آنا شرط ہے (مرتب)

۱۔ وقت کا ولی اللہ، اللہ کا بندۂ خاص اپنا وقت گزار کر خالق حقیقی سے جا ملا۔ تدفین سے قبل نماز جنازہ کی تیاریاں ہیں۔ سینکڑوں لوگ رنجیدہ اور اشکبار کھڑے ہوئے ہیں۔ نماز جنازہ سے قبل وصیت نامہ پڑھا جاتا ہے۔ یہ کیسی وصیت ہے ؟"میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی تہجد قضا نہ ہوئی ہو، جس نے نماز عصر کی سنتیں نہ چھوڑی ہوں اور جس نے ہمیشہ نماز کو تکبیر اولیٰ کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام کیا ہو۔" وصیت پڑھ کر سنا دی گئی اور لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ایسا کون ہوگا جس نے کبھی تہجد بھی قضا نہ کی ہو، عصر کی سنتیں اور تکبیر اولیٰ چھوٹ جانے کا امکان بھی ہر وقت رہتا ہے تو ایسے میں نماز جنازہ کون پڑھائے؟ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ وقت بڑی تیزی سے گزرنے لگتا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو ان شرائط پر پورا اترتا ہو، تو پھر نماز جنازہ کون پڑھائے؟ چہ مگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ اچانک حاکم وقت آگے بڑھتا ہے۔ ۔اس کا چہرہ سرخ ہے اور حالت ایسی ہے جیسے کوئی اہم راز فاش ہوگیا ہو۔ حاکم یہ کہہ کر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے آگے آجاتا ہے۔ "لوگ مرجاتے ہیں اور

دوسروں کے راز فاش کر جاتے ہیں۔" (الف) یہ حاکم کون ہے جو نماز جنازہ پڑھاتا ہے۔ (ب) وہ ولی اللہ کون ہے۔ جنھوں نے شرائط عائد کیں۔

●●

۲۔ پروشیا جرمنی کا رہنے والا یہ پچاس سالہ ریاضی اور فزکس کا پروفیسر اپنی لیبارٹری میں بیٹھا ہوا اپنے معمول کے تجربات میں مصروف تھا۔ اس نے سیاہ کاغذ میں لپٹی ہوئی شیشے کی نلی میں سے روشنی کی شعاع کو گزارنے کی کوشش کی شیشے کی نلی میں سے ہوا بالکل خارج کردی گئی تھی اور اب اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ بجلی کی رَو گزرتے ہوئے کسی طرح کی روشنی نظر آئے....... مگر وہ اس وقت حیران رہ گیا جب اس عمل کے دوران' قریب ہی پڑے ہوئے۔ "بیریم پلاٹینو سائنائیڈ" کے ذرے چمک اٹھتے ہیں۔ پھر اس نے نلی اور ذروں کے درمیان بہت سی اشیاء کو رکھ کر دیکھا مگر بجلی کی رو جب بھی گزری ذرے چمک اٹھتے۔ اس کا چہرہ بھی خوشی سے چمک اٹھا۔ اسے نئے امکان جو نظر آگئے تھے۔ اس نے مزید تجربے کئے تو ثابت ہوا کہ شعاع ان مادوں سے گزر جاتی ہے۔ جہاں سے روشنی نہیں گزرتی بس اس بات کا ثابت ہونا تھا کہ ایک بڑی دریافت سامنے آگئی۔

(الف) آپ اس دریافت کو کس نام سے جانتے ہیں؟ (ب) یہ سائنس دان کون تھا؟ اس کا نام بتایئے؟

●●

۳۔ ایک دن اپنے ملازم کے ساتھ سیر کو نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ضعیف العمر شخص بڑی مشکل سے چل رہا ہے...... ابھی تھوڑا سا فاصلہ مزید طے کیا ہوگا تو دیکھا کہ ایک مریض سخت تکلیف کے عالم میں کراہ رہا ہے ..... پھر چند لمحوں بعد ایک بے گور و کفن لاش کو دیکھا۔ ملازم جو ساتھ ساتھ چل رہا تھا' مخاطب ہوا اور کہنے لگا ....."ایک دن ایسا آئے گا جب آپ بوڑھے ہوں گے' پھر بیمار پڑیں گے اور تکلیف سے آہ و بکا بھی کریں گے۔ پھر آپ بھی مرجائیں گے اس واقعے کے بعد وہ کھویا سا رہنے لگا۔ وہ ہر وقت بس یہی سوچتا رہتا کہ زندگی کیا ہے؟ زندگی سے دکھ اور آلام کس طرح کم کئے جاسکتے ہیں؟ سچی خوشی کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟ برسوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے اپنے سوالوں کا جواب پانے کی کوشش کی اور غور و خوض کرتا رہا۔ آخر کار اس نے جواب پالیا۔ اسے عرفان حاصل ہوگیا پھر اس کی تعلیمات کا آغاز ہوا اور لوگ جوق در جوق اس کی

طرف آنے لگے۔ اس کے ماننے والے آج بھی چین، بھارت، نیپال اور جاپان تک لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

(الف) شخصیت کا معروف اور اصل دونوں نام بتایئے۔ (ب) جس درخت کے نیچے بیٹھ کر عرفان حاصل کرنے کی کوشش کی وہ جگہ کونسی اور کہاں واقع ہے ؟"

●●

۴۔ یہی کوئی ۱۳ سال کی عمر ہوگی۔ اس عمر میں زندگی کی پہلی غزل کہی اور ڈرتے ڈرتے ابا حضور کو دکھائی۔ تیرہ سال کا لڑکا بھلا کیا غزل لکھے گا؟ ابا نے ایک اچٹتی نظر ڈالی اور پھر حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس عمر میں اتنی پختہ شاعری!! پہلا ہی شعر کمال فن کی معراج تھا۔

کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

غزل پسند نہ آنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی مگر مشورہ یہی دیا گیا کہ مرثیہ اور سلام لکھو۔ چنانچہ یہی کیا۔ زندگی بھر مرثیے اور سلام لکھے۔ یوں تو کئی شعراء نے مرثیے لکھے مگر اس فن میں کوئی ان کی خاک پا کو بھی نہ پہنچ سکا۔ ان کی شاعری میں جنگ و جدل اور یاس و الم کی جو منظر کشی ہے وہ کسی اور کے ہاں نہیں ملتی۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے لکھنؤ ہی میں مدفون ہیں۔

(الف) اس شاعر کو کس نام سے شہرت حاصل ہوئی اور یہ کہ اصل نام کیا تھا؟ (ب) ان کا کوئی ایک مشہور شعر لکھئے۔

●●

۵۔ چیونٹی پانی کے حوض میں گر گئی۔ ننھی سی چیونٹی پانی سے باہر نکلنے کے لئے جونہی مٹی کے خشک کنارے تک پہنچتی۔ دوبارہ پانی میں گر جاتی. پانی سے نکلنے اور پانی میں گرتے رہنے کا یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا مگر کسی ایک لمحے بھی چیونٹی نے ہمت نہ ہاری اور وہ پانی سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی رہی۔ آخر کار وہ کامیاب ہو ہی گئی۔ چیونٹی کے پانی میں گرنے کا اور باہر نکلنے کا یہ سارا عمل اس سالار نے بڑے غور سے دیکھا۔ حال ہی میں ایک جنگ سے نامراد لوٹنے کے بعد وہ قدرے مایوس تھا لیکن چیونٹی کے اس واقعے نے اسے ایک نیا سبق دیا تھا۔ "مسلسل جدوجہد کرتے رہنے کا سبق اور کبھی مایوس نہ ہونے کا سبق۔" اس نے پھر سے اپنی فوج کی صفوں کو درست کیا، نئی حکمت عملی وضع کی اور نئے عزم و ہمت کے ساتھ دشمن پر پل پڑا۔ وہ کامیاب ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے وسط ایشیا پر قابض ہوگیا۔ ہندوستان کا رخ کیا تو دہلی تک کا

علاقہ فتح کرلیا۔ مغل حکمرانوں کو اس کی اولاد کہا جاتا ہے۔

(الف) شخصیت کا نام بتائیے؟

(ب) شخصیت کہاں مدفون ہے؟

درست جوابات قصہ کوئز نمبر ۳۔

نومبر ۱۹۹۶ء

۱۔ (الف) عطاء اللہ شاہ بخاری

(ب) ملتان۔

۲۔ (الف) قائداعظم محمد علی جناح

(ب) پاکستان بنایا۔

۳۔ (الف) انگلستان

(ب) ڈاکٹر ایڈورڈ جینر

۴۔ (الف) سبکتگین

(ب) غزنی

۵۔ (الف) جون آف آرک

(ب) زندہ جلادی گئی

انعامات کا اعلان آئندہ ماہ خاص نمبر میں ملاحظہ کیجئے۔

مرتب

دعا

رب سے ہمارے تعلق کا دوسرا نام ہے

ادارہ آنکھ مچولی نے منتخب دعاؤں کے ۱۲ خوبصورت اسٹیکرز تیار کیے ہیں

ایسی دعائیں

جو نظر کے سامنے ہوں تو اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتیں

۱۲ اسٹیکرز کا ہدیہ ۳۶ روپے صرف

آنکھ مچولی کے پتے پر خط لکھئے یا فون کیجئے

اے پی آئی بی کالونی - کراچی فون ۴۹۴۲۸۵۷ ، ۴۹۴۸۲۱۰

صحیح ترتیب ـ بنائے ادیب

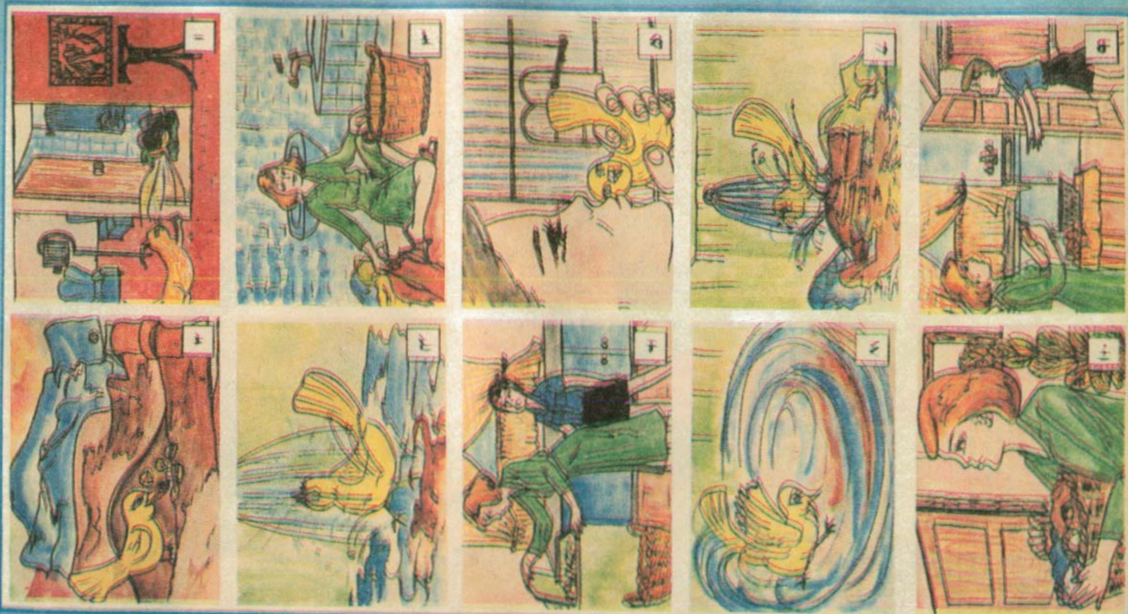

سامنے دی گئی تصویریں اگر ترتیب سے لگا دی جائیں تو ایک مکمل کہانی بن سکتی ہے ۔ یہ آپ کی ذہانت کا امتحان ہے اور انعامی مقابلہ بھی ۔ تصویروں کے نمبر اپنی مرضی سے ترتیب دیجئے اور پھر اس ترتیب کے مطابق ایک کہانی لکھ ڈالیے ۔ تو اٹھایئے قلم، قیمتی انعامات آپ کے منتظر ہیں ۔

ہم پاکستانی بچّے

ہم پاکستانی بچے ہیں

ضیاء حنان

آنکھوں میں مدینہ بستا ہے
سینوں میں محبت روشن ہے
ہاتھوں میں شجاعت کے جھنڈے
ہونٹوں پہ وفا کے قصے ہیں
ہم پاکستانی بچے ہیں

ہر دیس ہمارا مسکن ہے
ہر عہد ہمارا جوبن ہے
ماضی سے حرارت لیتے ہیں
بنیاد میں کتنے سچے ہیں
ہم پاکستانی بچے ہیں

اندیشوں کی یلغار میں ہم
ایمان و یقیں کا لشکر ہیں
ہے آج ہمارا پائندہ
اور کل کے بھی پل اچھے ہیں
ہم پاکستانی بچے ہیں

جانور آپ کی محبت کے مستحق ہیں

جانور بے زبان ہوتا ہے اس لیے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتا۔ مگر جانور آپ کے پیار کو محسوس کر کے آپ کا مطیع ضرور بن سکتا ہے

جانور اگر درندہ نہیں تو اُس سے محبت کیجیے اس کا خیال رکھیے

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حُسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

اِنھیں نہ ماریئے ——————

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

لطیفے شطیفے

انعامی لطیفہ

پہلا پڑوسی : "آپ کا کتا بہت ہی نالائق ہے۔ جیسے ہی میں گانا شروع کرتا ہوں یہ بھونکنے لگتا ہے۔"

دوسرا : "پڑوسی اس میں کتے کا کیا قصور، ابتداء تو آپ ہی کرتے ہیں۔"

مرسلہ : جبران خلیل، گوا،

ایک مشہور گلوکار کو معاوضہ دیتے ہوئے پروڈیوسر نے کہا "اتنا معاوضہ تو ہمارے ملک میں وزیر بھی نہیں لیتے۔"

گلوکار نے فوراً جواب دیا۔ "تو پھر آپ کسی وزیر ہی کو گانے کے لئے بلا لیجئے۔"

مرسلہ : جویریہ اقبال، گوجرانوالہ

☆ --- ☆ --- ☆

شوہر نے چیخ کر بیوی سے کہا۔ "دیکھو منے نے

میرا افسانہ پھاڑ کر پھینک دیا۔"
بیوی نے بڑے فخر سے مسکرا کر جواب دیا۔ "ماشاء اللہ نظر نہ لگے، ہمارا منا تو پیدائشی نقاد معلوم ہوتا ہے۔"

مرسلہ : جنید اختر، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک خاتون جب اپنے شوہر کی کتابوں سے تنگ آگئیں تو انہوں نے اخبار میں یہ اشتہار دیا :
میرے شوہر کی پانچ ہزار کتابیں خریدیئے، صرف سو روپے میں خریدنے کے لئے آج ہی ٹیلی فون پر رابطہ کریں۔ اگر ٹیلی فون پر کسی مرد کی آواز آئے تو ٹیلی فون فوراً بند کردیجئے۔ ورنہ سودا نہ ہوسکے گا۔

مرسلہ : عظمیٰ ہارون، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک ضرورت سے زیادہ محتاط اور وہمی خاتون نے ڈاکٹر سے پوچھا "میرے بچے کے دانت نکلنے والے ہیں، آخر میں کیسے معلوم کرسکتی ہوں کہ دانت نکلنا شروع ہوگئے ہ؟"
"منہ میں انگلی ڈال کر دیکھنے سے معلوم ہوجائے گا۔"
"لیکن انگلی میں تو جراثیم ہوسکتے ہیں ڈاکٹر؟" خاتون نے گھبرا کر کہا۔"اچھا" ڈاکٹر نے خاتون کی گھبراہٹ دیکھ کر کہا۔ "پہلے انگلی کو کھولتے ہوئے پانی میں ابال لیجئے گا۔"

مرسلہ : سعدیہ حبیب، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک ہوٹل کا مالک ڈاکٹر کے پاس آیا اور پیٹ درد کی تکلیف بیان کی۔
ڈاکٹر نے کہا : "معلوم ہوتا ہے آج آپ نے کھانا اپنے ہی ہوٹل میں کھالیا ہے۔"
ہوٹل کے مالک نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بس یہی غلطی ہوگئی۔"

مرسلہ : رومانہ ظہور احمد، پنڈی بھٹیاں

☆ --- ☆ --- ☆

ایک بوڑھے دیہاتی کو ڈاکٹر نے بتایا کہ "اس کی دائیں ٹانگ میں تکلیف کی وجہ عمر کا تقاضا ہے۔"
بوڑھے نے چڑ کر کہا۔ "دوسری ٹانگ بھی تو اسی عمر کی ہے لیکن وہ تو اچھی بھلی ہے۔"

مرسلہ : نازش اختر، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک موٹے آدمی کو ڈاکٹر نے گھوڑے کی سواری کا مشورہ دیا۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر نے اپنے مریض سے ٹیلی فون پر دریافت کیا۔ "کہیے کچھ دبلے ہوئے؟"

موٹے آدمی نے جواب دیا۔ "میں تو نہیں البتہ گھوڑا بے حد دبلا ہوگیا ہے۔"

مرسلہ : راجہ فہد طارق، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

جج : (چور سے) "تم نے سائیکل کیوں چرائی؟"

چور : "حضور! سائیکل قبرستان میں کھڑی تھی، میں سمجھا اس کا مالک مرگیا ہے۔"

مرسلہ : رضیہ سلطانہ، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک سیاست دان ووٹر کے پاس گیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ ووٹر نے جواب دیا! "جناب! میں ایک دوسرے امیدوار سے وعدہ کرچکا ہوں۔"

"اوہو! سیاستدان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم بھی کتنے بھولے ہو۔ میرے بھائی سیاست میں وعدہ اور اس پر عمل دو متضاد چیزیں ہیں۔"

ووٹر بولا "یہ بات ہے تو میں آپ کو ووٹ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

مرسلہ : محمد شعیب طاہر، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

اشرف : (اپنے دوست سے) "میرے خواب ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔"

دوست : "وہ کیسے؟"

اشرف : "مثلاً" کل میں کلاس میں ڈیسک پر سوگیا۔ خواب میں دیکھا کہ ماسٹر صاحب مجھے چھڑی سے پیٹ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو ماسٹر صاحب سچ مچ مجھے چھڑی سے پیٹ رہے تھے۔"

مرسلہ : راجہ ابرار حسین، راولپنڈی

☆ --- ☆ --- ☆

استاد : (شاگرد سے غصے میں) "ابے الو! کہاں رہتا ہے؟"

شاگرد : (معصومیت) "جی گھونسلے میں۔"

استاد : (جھنجلا کر) "گدھا"

شاگرد : "دھوبی کے یہاں۔"

استاد : (طیش میں آکر) "نالائق"

شاگرد : "جناب اس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں۔"

مرسلہ : ایمن ایوب، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک آدمی کو باؤلے کتے نے کاٹ لیا۔ اس کو اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دوست اس سے ملنے گیا اور پوچھا۔ "کیوں دوست، کیا حال ہے؟"

"حال تو ٹھیک ہے۔" اس نے جواب دیا "بس کبھی کبھی بھونکنے کو جی چاہتا ہے۔"

مرسلہ : بلال یوسف، کراچی

ریلوے اسٹیشن پر ایک مسافر نے دیکھا کہ ایک آدمی دو بھاری بھرکم سوٹ کیس اٹھائے آرہا ہے۔ جب وہ مسافر کے پاس سے گزرا تو مسافر نے اس سے وقت پوچھا۔

"جی ہاں بالکل۔" یہ کہہ کر اس آدمی نے اپنی گھڑی پر ایک چھوٹا سا بٹن دبایا اس کے ساتھ ہی ایک آواز گونجی۔ "سوا آٹھ۔" اس کے بعد اس نے گھڑی پر ایک اور بٹن دبایا۔ فوراً ہی اندر سے چھوٹی سی (T-V) اسکرین ابھری جس ر صبح کی خبریں نشر ہورہی تھیں۔ ایک اور بٹن بانے سے موسیقی سنائی دینے لگی۔ مسافر نے س گھڑی کے کمالات دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اس کے 100 ڈالر دیتا ہوں۔" ہ آدمی مان گیا اور گھڑی اسے دے دی۔ مسافر ھڑی لے کر جانے لگا تو آدمی نے سوٹ کیسوں ں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : "کیا آپ گھڑی کی بیٹریاں نہیں لے کر جائیں گے۔"

وسیم اطہر، بوری والا۔

☆ --- ☆ --- ☆

باپ : (بیٹے سے) "بیٹا! تم رات کتنے بجے تک پڑھتے ہو؟"

بیٹا : "۱۱ بجے تک۔"

باپ : (حیرانگی سے) "لیکن ۹ بجے تو بجلی چلی جاتی ہے۔"

بیٹا : (گھبراتے ہوئے) "دراصل ابا جان میں پڑھائی میں اتنا مگن ہوتا ہوں کہ بجلی چلے جانے کا مجھے پتہ ہی نہیں چلتا۔"

مرسلہ : حیات میر افضل، حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

گاہک، قصائی سے : "دیکھو بھئی اتنی دیر ہوگئی تم نے ابھی تک مجھے فارغ نہیں کیا، آخر مجھ میں تم کو کیا برائی نظر آرہی ہے؟"

قصائی : "صاحب بس بس کچھ صبر کرلیں اس کے بعد آپ کا ہی قیمہ بناؤں گا۔" ●●●

نامے میرے نام

غصہ تو ہمارے لکھاریوں کی ناک سے چپکا رہتا ہے۔ آپ سرگودھا کی ارم عثمانی صاحبہ ہی کو دیکھ لیجئے لکھتی ہیں۔ "آپ ہر زاویئے سے چاہے وہ قائمہ ہو یا منفرجہ یا کوئی اور ظالم انسان ہیں وہ اس طرح کہ میں نے آپ کو بوری بھر کر تحریریں بھجیں مگر اف...... آپ اتنے ظالم ہیں کہ کوئی ایک تحریر بھی شائع نہیں کی۔ چلیں کوئی تحریر نہ سہی۔ میرا نام ہی ناقابل اشاعت میں شائع کردیا ہوتا۔" آخر میں ارم عثمانی صاحبہ نے ایک کارٹون بنایا ہے۔ ہو نہ ہو یہ کارٹون مدیر ہی کا ہے۔ مدیر صاحب کی گز بھر کی زبان باہر لٹکی ہوئی ہے اور دو آنکھیں پھٹی پڑ رہی ہیں۔

○ ارم صاحبہ! آپ کا خط پڑھنے کے بعد ہم نے اپنے دفتر کی تمام بوریاں دیکھ لیں مگر کسی بوری سے بھی آپ کی تحریر برآمد نہیں ہوئی۔ ملک بھر کے لکھنے والے ہمیں اپنی تحریریں لفافے یا کاغذ میں بھجواتے ہیں۔ یہ آپ کو بوری میں بھجوانے کی کیا سوجھی۔ اور ہاں ہم ظالم بھی نہیں ہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم بے حد مظلوم ہیں۔ دیکھیئے نا جس کا جی چاہتا ہے ہمیں ڈانٹ دیتا ہے۔ جو لقب دینا چاہیے دے ڈالتا ہے اور ہم کچھ کہہ بھی نہیں پاتے۔ ارم آپ اچھا لکھیئے تحریر ضرور شائع ہوگی۔ آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مزاح اچھا لکھ سکتی ہیں کوشش کیجئے ہمت نہ ہاریئے ہم ایک اور بوری کے منتظر ہیں۔

سراج اکبر آتش صاحب نے **پنجگور** سے خط لکھا ہے۔ یہ خط جس لیٹر پیڈ پر لکھا ہے اس پر ایک خاتون تبت سنو کا اشتہار بنی بیٹھی ہیں۔

○ دیکھئے سراج اکبر صاحب! یہ خاتون اگر آپ کی جاننے والی ہیں اور انہوں نے اپنی تصویر لیٹر پیڈ چھاپنے کی اجازت دے رکھی ہے تب تو ہم کچھ نہیں کہتے لیکن اگر آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں تو یوں خواتین کو رسوا کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ ویسے بھی سادے کاغذ پر خط لکھنا اچھا لگتا ہے۔ آپ نے عادل منہاج اور الطاف حسین سے قلمی دوستی کرنے کی خاطر ان کے پتے مانگے ہیں۔ بھئی پہلے ہمیں ان سے بھی تو معلوم کر لینے دیں کہ آیا وہ بھی آپ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ ویسے آپ آنکھ مچولی کے کسی بھی معروف قلم کار کو خط لکھنا چاہیں تو آنکھ مچولی کے پتے پر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ ہم آپ کا خط انہیں ضرور پہنچا دیں گے۔

گوجرانوالہ سے حمیرا ناز سرور نے خط لکھا ہے، تاریخ نہیں لکھی، لکھتی ہیں "پلیز میرے اچھے بھیا' میری کہانی شائع کر دیجئے نا۔ بڑی محنت سے لکھی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ آنکھ مچولی کی قیمت بڑھنے کا مجھے کوئی غم نہیں۔ آنکھ مچولی سے مجھے بے حد محبت ہے اور ویسے بھی آپ نے جان بوجھ کر تو قیمت بڑھائی نہیں ہے۔ یقیناً "کوئی وجہ ہوگی۔"

○ خوش رہیئے بہناں حمیرا ناز! ہمیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے کھلے دل کے ساتھ آنکھ مچولی کی موجودہ قیمت کو مناسب جانا اور قیمت بڑھانے کی مجبوری کو سمجھا۔ کاش! سب پڑھنے والے ہی یہ جان لیں کہ اگر آنکھ مچولی کی قیمت قدرے زیادہ ہے تو اس میں گڑ بھی تو زیادہ ہے۔ آنکھ مچولی پسند کرنے کا شکریہ ...... رہ گئی کہانی کی اشاعت کی بات تو ہم ڈرتے ڈرتے لکھ رہے ہیں کہ شائد آپ کی کہانی ...... شائع ...... نہ ...... ہو ...... سکے ...... ایک مشورہ یہ دے رہا ہوں کہ آپ کہانی مختصر لکھا کریں۔ خیال آسان سا منتخب کریں اور اپنے اسلوب کو بھی سیدھا سادا رکھیں آپ میں اچھی ادیبہ بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

خرم معراج، پرانا سکھر سے آگ بگولہ ہیں۔ ان کے خط کی ایک ایک سطر پر ہمیں ان کی قہر آلود نظروں نے گھورا۔ لفظوں سے دھمکایا، ڈرایا اور سمایا ہے ...... اور معاملہ بس اتنا سا ہے کہ ان کی دو کہانیوں پر انہیں معاوضہ نہیں دیا گیا۔

○ بھائی خرم معراج! آپ کا خط پڑھ کر غالب کا شعر یاد آگیا۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ، لفظوں کی حرمت کا محافظ ادیب کیا دو تین سو روپے کی خاطر اس قدر آپے سے باہر ہو جائے گا میں اگر آپ کا خط من و عن شائع کر دوں تو پڑھنے والے آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ یہاں پر ہمارے ادارے میں گزشتہ دو تین ماہ میں اتنی تبدیلیاں آئی ہیں کہ

اب تو وہ تمام لوگ نہیں رہے' جنہوں نے آپ کی کہانی کو منتخب کیا' شائع کیا یا آپ سے اعزازیئے کا وعدہ کیا۔ ہمیں تو آپ کا پہلا خط ملا ہے اور دیکھئے ہم نے آپ کو جواب بھی دے دیا۔ مفصل خط آپ کو بعد میں لکھوں گا۔

شگفتہ صدیقی نے ایک تعویز نما خط ہمیں بھجوایا ہے۔ اس خط کے سائز کو دیکھیں تو پہلی نظر میں اس پر "پھرّے یا کارتوس" کا گمان ہوتا ہے' جسے طالب علم جوتوں میں چھپا کر امتحان ہال میں لے جاتے ہیں۔ لیکن جب اس خط کو پڑھا تو یہ چھوٹا سا خط اچھا جامع اور خوبصورت لگا۔ یہ خط خود تنقیدی کا بہترین نمونہ ہے' شگفتہ لکھتی ہیں "میں نے مضمون لکھنے میں ذرا سی بے اصولی کردی ہے۔ معذرت۔ ہم جب لکھتے ہیں تو رف اور فیئر کا خیال نہیں رکھتے۔ لکھائی (خوشخطی) پر توجہ نہیں دیتے۔ ضخیم مضمون کو ایک لفافے میں ٹھونس دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

○ شگفتہ! جو بات ہم کہنا چاہتے تھے وہ آپ نے خود کہہ دی۔ آپ کے توسط سے ہم تمام لکھنے والوں سے گزارش کریں گے کہ' صاف لکھا کریں۔ صفحے پر اتنی جگہ چھوڑ دیا کریں کہ ہم کچھ تبدیل کرنا چاہیں تو کرلیں۔ اپنا مضمون کہانی کسی سینئر قلم کار کو دکھالیا کریں۔ یہ سب کچھ ہوجائے۔ تو کتنا اچھا ہو اور ہاں شگفتہ آپ کی تحریر پر بحث کی بڑی گنجائش ہے۔ وسیع موضوع ہے جو تحقیق کے بغیر بہتر نہیں لکھا جاسکتا۔ اچھی بات یہ ہوگی کہ آپ آسان موضوعات پر مختصر تحریریں لکھیں۔ اس بار معذرت۔

مسعود افضل اور رحمت علی نے منڈان' بنوں سے پیارا سا خط لکھا ہے۔ دو تحریریں بھی بھیجی ہیں۔ نویں جماعت کے ان ساتھیوں نے بزرگوں کی طرح صحت و تندرستی اور درازیِ عمر کی دعائیں بھی کی ہیں اور لکھا ہے کہ "ہم پہلی بار آپ کی محفل میں شرکت کی گستاخی کررہے ہیں۔"

○ بھائی مسعود افضل اور رحمت علی! ہماری محفل میں آنا گستاخی کیوں کر ہوا' یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آپ کی دونوں تحریریں مل گئیں مگر اشاعت کا فیصلہ نہیں ہوا۔ یہ بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ تحریروں کو پسند کرنے کے معاملے میں ہمارا معیار قدرے کڑا ہے اس لئے اگر شائع نہ بھی ہوں تو دل چھوٹا نہ کیجئے گا اور رابطہ باقی رکھئیے گا۔ آپ کی بے حد و حساب محبتوں پر ہم آپ کے ممنون ہیں۔

بنت عفت ضیاء' لاہور سے مخاطب ہیں۔ عفت کو ناقابل اشاعت والا صفحہ بہت پسند ہے۔ بس آنکھ مچولی کا ورِ سے آنا پسند نہیں۔ انہوں نے ایک خوبصورت کہانی بھی ہمیں بھجوائی ہے۔

لئے اگر آپ کہیں تو ہم آپ کا نام آپ کے پسندیدہ صفحے پر بھی شائع کرسکتے ہیں۔ آنکھ مچولی کا شمارہ اس بار تو آپ کو جلدی مل گیا ہوگا۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اب یہ کبھی تاخیر سے نہ آئے۔ ہمارا شکریہ آپ کو پہنچے۔

دو بڑے مزے دار خط میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ایک خط کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی کم سن ساتھی کا ہے، لکھا ہے "میرا خط شائع نہ کیا تو پھر....... ؟؟ دیکھا ڈر گئے ناں۔

○ کاش! انہوں نے اپنا نام بھی لکھا ہوتا تو ہم انہیں مخاطب کرکے پوچھتے کہ ڈرانے سہانے کے لئے کیا ہم ہی رہ گئے ہیں کیا؟ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجھے بہت سی کہانیاں آتی ہیں۔ مثلاً "ایک تھا بادشاہ یا شائد دو تھے بادشاہ...... نہیں ایک ہی تھا بادشاہ..... غور سے دیکھا تو وہ بادشاہ بالکل نہیں تھا....."

○ کہیئے کیسی لگی کہانی آپ کو، ہمیں بھی بہت مزہ آیا۔ آپ ایسی کہانیاں لکھتے رہیں۔ کبھی نہ کبھی تو بات آگے بڑھے گی۔ بادشاہ کو کچھ حیا آئے گی اور وہ کچھ نہ کچھ کرگزرے گا۔

فہیمہ محمود کا خط بھی، ان کی کم عمری کا پتا دیتا ہے لکھتی ہیں کہ "جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس کے مقابلے میں حصہ لوں مگر کیا کروں ایک چھوٹے سے دیہات میں رہتی ہوں۔ جہاں کا ڈاک کا نظام اچھا نہیں۔ خط دیر سے ملتا ہے۔"

○ فہیمہ! آپ کی چند سطریں ہی اتنی اچھی لگیں کہ ہم نے انہیں آنکھ مچولی میں جگہ دینا ضروری سمجھا۔ آپ کے شعر اور اقوال تو مل گئے۔ مگر آپ نے یہ نہیں لکھا کہ یہ اقوال کس کے ہیں؟ غلطی آپ کی ہے۔ آئندہ بھیجیں تو اقوال پر شخصیات کے نام ضرور لکھیں۔

بلقیس محمودہ خاتون صاحبہ نے شرف آباد کراچی سے ایک خط اور ایک نظم بھجوائی ہے۔ یہ نظم ان کی نواسی کی ایک دوست نے مدینہ منوّرہ میں انہیں دی تھی۔ عائشہ آزادی نے "کراچی" کے موضوع پر ایک خوبصورت نظم تخلیق کی ہے۔ یہ نظم یوں بھی اس مقدس شہر سے آئی ہے کہ اسے پڑھنے سے پہلے آنکھوں پہ رکھنے کو جی چاہتا ہے مگر ہم کیا کریں کہ عائشہ نے اپنی نظم میں کراچی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ کراچی کچھ عرصہ قبل تو واقعی ایسا تھا مگر آج کل الحمد للہ صورت حال کچھ بہتر ہے اس لئے اب اس سنجیدہ اور رنجیدہ نظم کو رہنے دیتے ہیں۔ آپ نئی نظم لکھیں اور کسی شگفتہ موضوع پر لکھیں۔ ہمارا وعدہ کہ ہم اسے ضرور شائع کریں گے۔ آنکھ مچولی پسند کرنے پر عائشہ آزادی، اسما پاشا اور بلقیس محمودہ صاحبہ آپ سب کا بے حد شکریہ۔

سنہری مجسمے

غلام مصطفٰی تبسم

پرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک بادشاہ نے اپنے ہمسایہ ملک کے بادشاہ کو تین سنہری مجسمے بھیجے۔ ساتھ ہی ایک خط بھی بھیجا جس میں لکھا تھا :

"اگرچہ یہ تینوں مجسمے شکل و صورت اور وزن میں بالکل ایک جیسے ہیں اور کوئی شخص انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کوئی فرق ہے۔ لیکن ان کی قیمتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک راز کی بات ہے۔ اگر بادشاہ کے درباریوں میں سے کوئی درباری اس بھید کو سمجھ سکے تو ہمیں بہت خوشی ہوگی اور ہم اس شخص کو بہت سا انعام و اکرام بھی دیں گے۔"

بادشاہ نے جب خط پڑھ کر اپنے درباریوں کو سنایا تو وہ بہت حیران ہوئے اور سوچ میں پڑ گئے۔ وہ دن رات اس الجھن کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بادشاہ بہت پریشان تھا کہ وہ اس سوال کا کیسے جواب لکھے اور تحفہ بھیجنے والے کے روبرو کس طرح سرخرو ہو؟ وہ سوچتا تھا کہ "اگر ہماری طرف سے اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ گیا تو بڑی ندامت ہوگی۔"

وقت گزرتا چلا گیا اور دربار کے بڑے بڑے دانا لوگ اور بزرگ اس راز کو نہ پاسکے۔ رفتہ رفتہ یہ بات دربار سے نکل کر شہر میں پھیل گئی اور لوگوں نے اس بجھارت کو بوجھنے کی بہت کوشش کی، لیکن کامیاب کوئی نہ ہوسکا۔

آخر ایک دن ایک نوجوان دربار میں حاضر ہوا اور اس نے بادشاہ سے عرض کی :

"جہاں پناہ! آپ مجھے مجسمے دکھادیں۔ میں ایک نظر دیکھ کر بتادوں گا کہ اس میں کیا راز ہے؟"

نوجوان کو محل میں لے جایا گیا۔ اس نے بڑے غور سے ان مجسموں کو دیکھا اسے معلوم ہوا کہ مجسموں کے کانوں میں بڑے باریک سوراخ ہیں، جو آسانی سے نظر نہیں آتے۔

نوجوان نے ایک جھاڑو سے ایک باریک تیلی نکالی اور پھر اسے ایک مجسّمے کے کان میں ڈالا۔ تیلی اس مجسّمے کے منہ میں سے باہر نکل آئی۔ پھر اس نے دوسرے مجسّمے کے کان میں تیلی کو ڈالا اور وہ تیلی مجسّمے کے دوسرے کان سے باہر آگئی۔ جب تیلی کو تیسرے مجسّمے کے کان میں ڈالا گیا تو وہ تیلی اس کے پیٹ میں چلی گئی۔ نوجوان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ادب سے کہا :

"حضور! میں نے ان مجسّموں کا بڑے غور سے معائنہ کیا ہے میں بات کو سمجھ گیا ہوں۔ اب آپ حکم دیں تو ان مجسّموں کے بارے میں عرض کروں۔"

بادشاہ نے فوراً اجازت دے دی۔

نوجوان نے عرض کیا۔

"جہاں پناہ! جس طرح انسانوں کی طبیعتیں اور مزاج الگ الگ ہوتے ہیں، اسی طرح ان مجسّموں کی بھی الگ الگ خصوصیتیں ہیں۔

پہلے مجسّمے کی طبیعت ان لوگوں سے ملتی ہے جو کوئی بات سنتے ہیں تو فوراً اس کا ذکر دوسروں سے کردیتے ہیں۔ ایسے لوگ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔

دوسرا مجسمہ ان لوگوں کی طرح ہے جو کوئی بات سنتے ہیں تو اس پر بالکل دھیان نہیں دیتے۔ وہ بات کو ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔ ایسے لوگ بڑے لاپروا اور بے مغز ہوتے ہیں۔

تیسرا مجسمہ ان لوگوں کی مانند ہے جو بات کو سن کر اپنے دل میں بٹھا لیتے ہیں اور بغیر وجہ کے کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتے۔ ایسے لوگ بڑے عقل مند اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔

اب جس طرح زندہ لوگوں کے رتبے میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ان سونے کے مجسموں میں بھی فرق ہے اور یہی وجہ ہے کہ وضع قطع اور وزن، سب کچھ برابر ہونے کے باوجود بھی ان کی قیمتوں میں بہت فرق ہے اور یہ فرق ان کے مختلف اوصاف کی وجہ سے ہے۔ بس یہی ان مجسّموں کا راز ہے۔"

بادشاہ اس نوجوان کا یہ جواب سن کر بہت خوش ہوا۔ درباری بھی اس نوجوان کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے۔بادشاہ نے اپنے درباریوں سے مشورہ کرنے کے بعد فوراً جواب لکھ کر اپنے ہمسایہ بادشاہ کو بھیج دیا۔

بادشاہ نے جب نوجوان کا جواب پڑھا تو وہ بھی بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نوجوان کو اپنے بادشاہ کی طرف سے بھی بہت سا انعام و اکرام ملا۔

●●●

نقشوں کی دنیا

شیخ عبدالمجید عابدؔ

نقشے کے ذریعے آپ پلے سے کچھ خرچ کئے اور سفر کی صعوبت اٹھائے بغیر دنیا بھر کی سیاحت کرسکتے ہیں۔ نقشے کو کھولتے ہی سیر و سیاحت، خزانوں کی تلاش، کرہ ارض کے نامعلوم گوشوں کی تحقیق و تفتیش کے قصے اور واقعات لوح ذہن پر ابھر آتے ہیں۔ نقشہ کیا ہے؟ طلسمی قالین ہے۔ آدمی آرام دہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے جہاں جانا چاہتا ہے تھوڑی ہی دیر میں چشم زدن میں پہنچ جاتا ہے۔

آج کل تو نقشے عام ہیں اور بازار سے خریدے جاسکتے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ نقشے ایک راز سمجھے جاتے تھے اور ان کی بڑی حفاظت کی جاتی تھی۔ جو لوگ اس راز کو افشا کردیتے تھے انہیں سخت سزا اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات وہ موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے تھے۔ پرائیویٹ مسلح جہازوں کے ہاتھ اگر

کوئی بحری نقشہ لگ جاتا تو اسے سونے چاندی سے زیادہ گراں بہا مال غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں دنیا کا بہت کم حصہ انسان کو معلوم تھا۔ ایسے نقشے کا ہاتھ لگنا گویا قسمت کی کنجی ہاتھ لگنے کے مترادف ہوتا تھا۔ جس سے دولت کے سرچشموں کی طرف نئی نئی راہیں کھل سکتی تھیں۔ چنانچہ ٹائر کے ملاح اپنے بحر روم کی تجارتی راہوں کے نقشے چھپائے رکھتے تھے۔ عرب ملاح ادرک، کافور اور بیروزہ، روغن اور ریشم کے سرچشموں کا پتہ دینے والے نقشے چھپا کے رکھتے تھے۔ اسپینی نئی دنیا کے سونے کو پوشیدہ رکھتے تھے اور ڈچ شرق الہند کے گرم مصالحے کی اجارہ داری کو راز میں رکھتے تھے۔

کولمبس اور میگلان نے اپنے غیر قانونی بحری سفروں کے دوران میں جو بحری نقشے بنائے تھے انہیں سیویل کے محافظ خانوں میں محفوظ کردیا گیا تھا۔ لیکن ان پر للچائی ہوئی نظریں برابر پڑتی رہتی تھیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر رشوت اور چوری کے ذریعے پراسرار طور پر غائب کرلئے گئے۔ سترھویں صدی عیسوی میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۰ تختیاں جمع کیں جن میں ہندوستان اور آبنائے ملایا، چین اور جاپان (جہاں غیر ملکیوں کے لئے تمام نقشے ممنوع تھے) کو جانے والے بحری راستے دکھائے گئے تھے یہ خفیہ "اٹلس" کمپنی کے کپتانوں کے سوا کوئی استعمال نہ کرسکتا تھا۔

آج کل نقشہ نگاری ایک بین الاقوامی کاروبار بن چکا ہے۔ اب نقشے کی نوعیت ایک ایسی مشترکہ زبان کی سی ہوچکی ہے جسے دنیا بھر میں سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ عام سیاسی اور قدرتی نقشوں کے علاوہ سمندر کی تہہ اور غاروں کے نقشے بھی ملتے ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کے لئے ایک اچھا سا "اٹلس" کافی ہے۔ اس کے ذریعے ہم سمرقند اور استنبول جیسے قدیم شہروں اور سندھ اور دجلہ جیسے عظیم دریاؤں گولڈ کوسٹ، آئیوری کوسٹ، ونڈ وارڈ اور لیوارڈ جیسے جزیروں کی سیاحت کرسکتے ہیں۔

قدیم یونانی سب سے پہلے دنیا کی شکل و ہیئت سے اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ ایک کرہ ہے چنانچہ اس کی تصاویر کھینچیں۔ کلاڈس پہلا ماہر فلکیات اور جغرافیہ دان تھا جس نے سنہ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ اپنا عظیم اٹلس مکمل کیا۔ اس میں اس نے یونان کو دنیا کا مرکز ظاہر نہیں کیا ورنہ اس سے پہلے یونانیوں کا خیال تھا کہ یونان دنیا کے وسط میں واقع ہے۔ فتوحات اور بحری سفروں کی بدولت کلاڈس ڈنمارک تک جاچکا تھا اس لئے اس نے

اپنے "اٹلس" میں ڈنمارک اور جزائر شٹ لینڈ تک کے علاقے کو دکھایا جسے وہ انڈیا کا نام دیتا تھا۔ اونٹوں کے قافلوں سے جو نامعلوم مشرق سے ریشم لاتے تھے اور تاریک براعظم سے آنے والے سیاہ فام غلاموں اور ہاتھی دانتوں سے یہ قدیم یونانی اس سرزمینوں کے متعلق بعض قیاس آرائی کیا کرتے تھے۔ جو ان کے علم سے ماورا تھیں۔ اس عظیم دنیا میں وہ بحرروم کو ایک جوہڑ اور اپنے آپ کو اس جوہڑ کا ننھا منا سا مینڈک محسوس کرتے تھے۔

ازمنہ وسطیٰ میں یہ کیفیت تھی کہ راہب جو اپنی خانقاہوں کی دنیا سے کبھی باہر نہ نکلے تھے دنیا کے نقشے کھینچا کرتے تھے جن میں یوروشلم کو عموماً" دنیا کا مرکز دکھایا جاتا تھا۔ شمال کے بجائے مشرق کو اوپر کی طرف دکھاتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں وہاں باغ عدن تھا۔ انجیل میں زمین کے چار کونوں کا ذکر آیا ہے اس لئے بعض نقشہ نگار اس سے یہ مطلب لیتے تھے کہ دنیا مربع ہے یا مستطیل ہے چنانچہ اپنے نقشوں میں ایسا ہی دکھاتے تھے اور انہیں مضحکہ خیز عفریتوں کی تصویروں سے سجایا کرتے تھے جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ دنیا کے دور دراز کونوں پر رہتے ہیں۔ لیکن زیارت کے سفروں، صلیبی جنگوں، مارکوپولو کے چین تک کے سفر اور ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کرنے کے لئے افریقہ کے گرد پرتگیزوں کے بحری سفروں وغیرہ سے اس معلوم دنیا کی سرحدیں پھیلتی اور وسیع ہوتی چلی گئیں۔ "مغربی سمندر" میں جو نئے انکشافات ہوئے ان کا پہلا بے ڈھنگا سا نقشہ کولمبس کے ایک ساتھی کیپٹن جان ڈی لاکو سانے سنہ ۱۵۰۰ء میں بیل کی کھال پر کھینچا۔ ۱۵۰۰ء میں نئی دنیا کا پہلا مطبوعہ نقشہ منظرعام پر آیا جس کا ایک نسخہ اب تک باقی ہے اور برطانوی عجائب گھر میں موجود ہے۔ جہاں دنیا کے بہت سے نفیس ترین نقشے موجود ہیں۔

چونکہ زمین گول ہے اس لئے صحیح ترین نقشہ گلوب ہی ہو سکتا ہے لیکن گلوب یا تو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ تفصیلات ظاہر ہی نہیں کی جاسکتیں یا اتنے بڑے کہ استعمال کے قابل نہیں ہوتے اس لئے ہمیں نقشہ مسطح شکل میں کھینچنا پڑتا ہے حالانکہ وہ گول ہونا چاہئے۔ بظاہر یہ ایک ناممکن العمل صورت ہے مگر ایک منصوبے کے ذریعے اس ناممکن کام کو ممکن بنادیا گیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت دنیا کی اصل ہیئت کچھ بگڑ سی جاتی ہے۔ آدمی خط استوا سے روانہ ہوتا ہے تو اس بگاڑ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ گرین لینڈ

ناقابل یقین سفر

کولمبیا کے ایک تیرہ سالہ لڑکے نے امریکہ تک تین گھنٹے کا سفر ایک کارگو طیارے کے ٹائروں کے خلا میں چھپ کر کیا۔ جبکہ پرواز کے دوران طیارے کی بلندی کم از کم ۳۵ ہزار فٹ تھی۔ امریکی حکام لڑکے کے زندہ بچ جانے پر حیرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیونکہ چند سال قبل اسی طرح کولمبیا کے ایک نوجوان نے امریکہ پہنچنے کی کوشش کی مگر وہ مُردہ پایا گیا۔ لیکن تیرہ سالہ گولیر مور روزیلز معجزانہ طور پر زندہ بچ گیا۔ جب اسے باہر نکالا گیا تو وہ بے ہوش تھا اور برف کے گولے کی طرح نظر آرہا تھا۔ یہ امر بھی حیران کن ہے کہ جہاز کے بند ہوتے ہوئے ٹائر اسے کسی وقت بھی کچل سکتے تھے۔ جن سے وہ مکمل طور پر محفوظ رہا۔ روزیلز کولمبیا میں انتہائی غُربت کی زندگی گزار رہا تھا اور اپنی بھوک مٹانے کے لئے عموماً بگوٹا ایئر پورٹ پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے چیزیں اُٹھا کر کھایا کرتا تھا۔

جنوبی امریکہ سے کہیں بڑا نظر آتا ہے۔ حالانکہ جنوبی امریکہ اس سے آٹھ گنا بڑا ہے۔ چونکہ گلوب کو ٹھیک ٹھیک پھیلایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے زمین کے ایک چھوٹے سے علاقے کا نقشہ ہی صحت کے ساتھ کھینچا جاسکتا ہے۔ آج جو صحیح ترین نقشے دنیا میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک وہ نقشہ ہے جو برطانیہ کا آرڈیننس سروے ڈیپارٹمنٹ برطانیہ کے شہری علاقوں کا تیار کردہ ہے یہ نقشہ کئی اجزاء میں شائع ہوا ہے۔

ایک پیمانے کے مطابق اور ایک ہی قسم کے اشاروں کے ساتھ دنیا کا بین الاقوامی نقشہ تیار کرنے کی تجویز ویانا کے ایک جغرافیہ دان البرٹ پنک نے ۱۸۹۱ء میں پیش کی تھی۔ اس منصوبے کے مطابق ایک ایسے پیمانے پر نقشہ تیار کیا جاتا تھا کہ اس کی مختلف چادریں اور اجزاء پہلو بہ پہلو بچھا دیئے جائیں تو وہ ۳۶ فٹ قطر کے گلوب کو ڈھانک سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کا پھیلاؤ زمین کی جسامت کے دس لاکھویں حصے کے برابر پہنچ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں لندن میں ایک دفتر قائم کیا گیا جہاں ہر قوم کو اپنے ملک کے نقشے کی چادریں بھیجنی تھیں۔ دو عالمی جنگوں کی وجہ سے ہر بار یہ کام عارضی طور پر رکا بھی تاہم عام حالات میں جاری رہا۔

بہت سے ممالک نے بہت ہی نفیس اور جامع قسم کے نقشے تیار کئے ہیں۔ آج کل اس فن نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ ہم گھر بیٹھے دور دراز کے ملکوں کے متعلق بہت سی معلومات آسانی سے حاصل کرلیتے ہیں اور کچھ خرچ بھی نہیں کرنا پڑتا۔

●●●

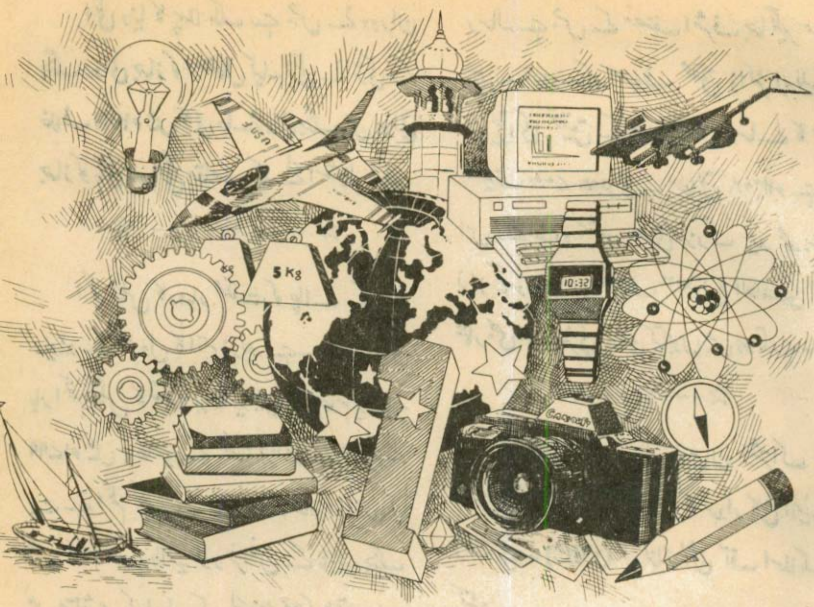

پہلی بار

محمد صابر

کش مکش کی اس دنیا میں ہر خاص و عام کام کسی نہ کسی نے پہلی بار ضرور کیا تھا۔ ایسا کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور کیا کیا ہوا؟ تاریخ کے صفحات سے یہ منفرد اور حیرت انگیز معلومات آنکھ مچولی کے قارئین کی دلچسپی کی نذر ہیں۔

31 مئی 1915ء کو دنیا میں پہلی بار کوئی شہر ایئر ریڈ (Air - Raid) یا فضائی حملے کا شکار ہوا۔ برطانیہ کے دارالحکومت لندن پر (Zeppelin) طیارے کے ذریعے فضائی حملہ کیا گیا۔ اور اس دوران لندن شہر پر 3,000 پونڈ وزن کے تقریباً 100 بم گرائے گئے جس کے نتیجے میں 3 افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔

☆---☆---☆

اٹلی دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے دوران جنگ ہوائی جہاز کو استعمال کیا۔ اٹلی نے ترکی کے خلاف 1911ء میں لڑی جانے والی جنگ میں ہوائی جہاز کو پہلی بار جنگی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

انکم ٹیکس کاروبار مملکت کو چلانے کے لئے ریونیو کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔ دنیا میں پہلی بار انکم ٹیکس کا تصور برطانیہ میں منظر عام پر آیا۔ ۱۷۹۹ء میں برطانیہ کے محکمۂ خزانہ کے افسر ولیم پٹ نے انکم ٹیکس کے قانون کے نفاذ کا اعلان کیا جس کا مقصد برطانیہ اور فرانس کے مابین جنگ میں متاثرین کی امداد کے لئے فنڈ جمع کرنا تھا۔

☆---☆---☆

لی کوان یو (Lee Kvan Yew) سنگاپور کے پہلے شخص ہیں جو ۳ جون ۱۹۵۹ء کو سنگاپور کی مکمل خود مختاری کے بعد سنگاپور کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ لی کوان یو طویل عرصے تک وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ ۲۸ نومبر ۱۹۹۰ء تک سنگاپور کے وزیراعظم رہے۔

☆---☆---☆

اردو نثر کی پہلی باقاعدہ تحریر تصوف کا ایک رسالہ ہے جس کے مصنف اشرف جہانگیر سمنانی ہیں۔ اردو کے معروف محقق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیق کے مطابق اس رسالے کا سنِ تصنیف ۷۰۸ **ھجری** بہ مطابق ۱۳۰۸ء ہے۔ اس کے علاوہ مشہور صوفی بزرگ سید محمد بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف "معراج العاشقین" کا شمار بھی اردو نثر کی اولین کتابوں میں ہوتا ہے۔

☆---☆---☆

اسلامی ممالک کے درمیان اشتراک و تعاون کے قیام میں (OIC) کا کردار کافی اہمیت رکھتا ہے۔ (OIC) آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز (Organisation Of Islamic Countries) کا مخفف ہے۔ اس ادارے کا صدر دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں واقع ہے۔ اور ۵۱ اسلامی ممالک کو اس ادارے کی رکنیت حاصل ہے۔ (OIC) کا پہلا سربراہی اجلاس ۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کو مراکش کے شہر رباط میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں اسلامی اُمّہ کو درپیش دیگر مسائل کے علاوہ اسرائیلی حکام کی طرف سے مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کا مسئلہ سرفہرست تھا۔

☆---☆---☆

کرکٹ

رضیہ عزیز

بیٹ ہے پیلا، دستہ لال
کاک کی کیسی پیاری بال
دونوں ہاتھ سے بلا پکڑوں
لمحے بھر میں گیند کو جکڑوں؟
پھر میں ایسا شاٹ لگاؤں
چھکوں کا اک شور جگاؤں
سو رن کی تکمیل ہو جب
چاروں جانب شور ہو تب
سب مجھ کو کندھے پہ اٹھائیں
اچھلیں کودیں ناچیں گائیں
کیسے گیند اور بلا لے لوں؟
ہائے میں اس سے کیونکر کھیلوں؟
یہ تو بھائی جان کا ہے
ان سے خطرہ جان کا ہے!

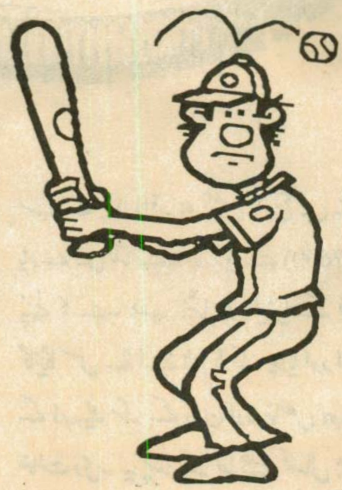

عجیب و غریب کرنسی

کمال احمد حاذمؔ

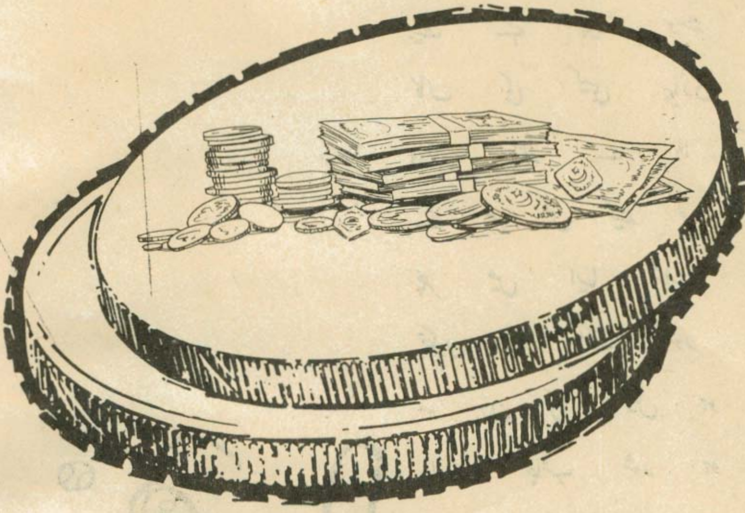

دنیا بھر کے ممالک کی کرنسی سکوں یا کاغذی روپے کی صورت میں ہوتی ہے۔ کاغذ کا نوٹ تو حال ہی کی ایجاد ہے۔ ورنہ قدیم زمانے سے دھات ہی کی کرنسی چلی آرہی تھی اور اب بھی یہ رواج بدستور قائم ہے۔ تاریخ سے اس بات کا حوالہ ضرور ملتا ہے کہ 18 صدی قبل مسیح میں بھی مغربی ایشیا میں سونے کے چھلے اور چاندی اور تابنے کے سکے وغیرہ بطور کرنسی چلتے تھے۔ مگر سب سے پہلا واقعہ جو ہمیں تاریخ میں سکے کے بارے میں ملتا ہے۔ وہ آج سے (2600) برس پہلے کا ہے۔ جب ایشیا میں لیڈیا کے فرمانروا گائیگاسس نے اپنے نام کا سکہ چلایا اور اپنی مہم کے ذریعے سکہ کے وزن اور خالص ہونے کی ضمانت دی۔ یہ پہلا سکہ تھا جیسے ٹکسال میں بنایا گیا تھا۔ اس کی شکل ایک دانے کی سی تھی اور یہ ایلکٹرم دھات کا بنا ہوا تھا۔ اس دھات میں

23 فیصدی چاندی اور 73 فیصدی سونا شامل ہوتا ہے۔ سکے میں ایک طرف ہل کا نشان بنا ہوا تھا اور دوسری طرف نہایت بھدے انداز میں فرمانروائے لیڈیا کی مہر تھی۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یونان والوں نے دھات کے سکے کی اہمیت سمجھ لی۔ چنانچہ سب سے پہلے یونانی سکہ ہمیں بادشاہ ارگسس کے وقت میں فیلڈن کے نام سے ملتا ہے۔ اس کے بعد بحیرہ روم کے ممالک میں بھی سکوں کے ڈھالنے کا رواج عام ہوگیا۔ چنانچہ آج کل کے مہذب ممالک میں بھی سکوں کی وضع قطع اور استعمال کا رواج ویسا ہی چلا آیا ہے۔ جیساکہ شروع میں ان ممالک میں تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات جو اس سلسلہ میں ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ غیر مہذب اور وحشی اقوام کے تمدن کی ہے۔ ان کے ہاں بھی دھات کے سکے بالکل وہی کام کرتے ہیں جو ہماری مہذب دنیا میں۔ گویا یہ لوگ دھاتوں کی اہمیت' اصلیت اور ماہیت کے بارے میں بہت کچھ نہیں تو تھوڑا بہت ضرور جانتے ہیں۔

عجیب و غریب کرنسی :

تمام مہذب ممالک کا روپیہ اس طریقہ کا بنایا جاتا ہے کہ ایک بڑی معقول رقم آپ اپنی جیب میں بھر کر گھوم سکتے ہیں۔ مگر بحرالکاہل کے بعض جزیروں میں کرنسی یا روپیہ اس قدر حجم والا اور وزنی ہوتا ہے کہ آپ ایک سکہ لے کر نہیں چل سکتے۔ نامعلوم زمانہ سے "یاپ" جزیرے کے باشندے چکی کے پاٹ کی طرح کے سخت چٹان کے بنے ہوئے سکے استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ ایک سکہ آٹھ فٹ سے بارہ فٹ تک قطر کا ہوتا ہے اور اس کی موٹائی چھ انچ سے بارہ انچ تک ہوتی ہے۔ یہ عجیب و غریب پتھر کے سکے قریب کے ایک جزیرے میں' جس کا نام پالاؤ ہے' بنائے جاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سوراخ کیا جاتا ہے تاکہ لکڑی ڈال کر انہیں لے کر چلنے میں آسانی ہو۔ ان سکوں کو پہیے کی طرح گھمانے کے لئے ہروقت دو غلام درکار رہتے ہیں۔

پتھر کے سکے :

ان پتھروں کے سکوں کی باقاعدہ ایک قانونی حیثیت ہے۔ اور انہیں "FEI" کہا جاتا ہے۔ ان کی قیمتیں ہاتھ سے ناپ کر مقرر کی جاتی ہیں۔ سب سے بڑے پتھر کا سکہ کوئی 12 فٹ کا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں اس کی قیمت تقریباً 560 روپے ہوتی ہے۔ ریزگاری اور خوردہ کے

استعمال کے لئے گھونگوں کے بٹن جیسے سکے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن پر بڑی نفیس پالش ہوتی ہے۔ بڑے سکے عموماً امیر لوگ رکھتے ہیں۔ یہ خوف تو ہوتا ہی نہیں کہ چور صاحب بلاتکلف پہاڑ کی ایک چٹان اٹھا کر لے جائیں گے۔ چنانچہ امیر لوگ اپنی دولت کا دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے اس چٹانی دولت کی فصیل اپنے گھر کے چاروں طرف کھڑی کرا دیتے ہیں۔

یاپ کے جزیرے کے لوگ شاید سب سے بڑے قدامت پسند اور پرانے ڈھب کے لوگ ہیں۔ انہوں نے جدید تمدن کی ہر نئی روش کو اپنے قریب آنے سے روکا ہوا ہے۔ بحرالکاہل کی تمام قسم کی کرنسیوں کا یہ عالم ہے کہ صرف وہی چیزیں کرنسی میں شامل کی جاتی ہیں جو مشکل سے حاصل ہوں۔ گویا یہ کلیہ وہاں بھی رائج ہے کہ جب تک کوئی چیز مشکل سے حاصل نہ ہو، اس کی قدر و قیمت انسان کے ذہن پر واضح نہیں ہو سکتی۔

دانت کے سکے :

جزائر سلومن میں کتے اور بھیڑیے کے دانت بطور کرنسی استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہاں ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک لالچی سوداگر نے یہاں کے وحشی باشندوں کو الو بنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے ان جزیروں کے باشندوں سے تجارت کرنے کی غرض سے ایک کاریگر سے جو کہ اس کا دوست تھا، روغنی مٹی کے مصنوعی دانت لاکھوں کی تعداد میں بنوائے۔ اِس کا دوست اور وہ خود اصلی اور نقلی دانتوں میں تمیز نہ کر سکا۔ اور یہ سوچ کر کہ وہ جزیرے کے لوگوں کو الو بنا سکے گا، یہ سکے لے کر جزیرے کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ جزیرے میں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی کیونکہ وہ پہلے بھی ان سے تجارت کرتا رہا تھا۔ مگر جب اس نے مصنوعی دانت جزیرے کے سردار کو کچھ موتی خریدنے کے عوض دیے تو اس نے انہیں اپنے دانتوں میں رکھ کر اور چبا کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آیا وہ اصلی ہیں یا نقلی؟ جزیرے کا سردار ابھی دانتوں کی جانچ پڑتال میں مصروف ہی تھا کہ سوداگر نے بھانپ لیا کہ اس کی چال پکڑی جائے گی۔ وہ جان بچا کر بھاگا اور بڑی مشکل سے دریا کے کنارے لگی ہوئی اپنی کشتی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ سردار جزیرہ سخت غصے میں تھا۔ اس نے ایک تیر مارا جو اس سوداگر کے بازو میں جا کر لگا۔ سوداگر مرا نہیں لیکن تمام عمر اس کا ایک بازو مفلوج رہا۔

بحرالکاہل کے دوسرے علاقوں میں بھی دانت کے سکے بکثرت چلتے ہیں۔ جزیرہ موجین میں جو نیو گینیا کے جنوب میں واقع ہے، مچھلی کے دانت بطور روپیہ استعمال کئے جاتے ہیں لڑیوں میں بعض مردہ جانوروں کے دانت بھی لگائے جاتے ہیں۔ لڑی کی لمبائی اور چوڑائی سے قیمت متعین کی جاتی ہے۔ جزائر فجی میں وہیل مچھلی کے دانت بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ نیو گینیا اور پاپوان کے جزائر میں شارک مچھلی کے دانت بڑے قیمتی سمجھے جاتے ہیں بلکہ پاپوان جزیرے میں تو کوئی شخص بھی اس وقت تک شادی نہیں کرسکتا جب تک شارک مچھلی کے دانت اس کے پاس پیش کرنے کے لئے نہ ہوں۔ بعض اوقات دو بلکہ تین چار جبڑے تک شادی کی قیمت میں طلب کئے جاتے ہیں۔ شارک آدم خور اور خوفناک مچھلی ہے۔ لیکن اس جزیرے میں کسی بھی شخص کو شادی کرنے کے لئے اس کا شکار کرنا پڑتا ہے۔

گھونگے کا روپیہ

گھونگے کا روپیہ بھی بحرالکاہل میں عام طور پر چلتا ہے۔ جزائر سکومن میں اور دیگر بہت سے جزائر میں ہزاروں لوگ محض گھونگے کے سکے بنانے کا کام کرتے ہیں اور یہ لوگ ان گھونگوں کی تلاش میں ساحل ساحل پھرتے رہتے ہیں۔ انہیں حاصل کرکے یہ لڑیاں بناتے ہیں اور دوسرے جزیروں کے لوگوں کے ہاتھوں ان کے بدلے غذا اور دیگر سامان حاصل کرتے ہیں۔ سفید گھونگے ہر شخص استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن لال گھونگے صرف سردار ہی خاص موقعوں پر بیچتا اور مبادلہ میں دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے جزائر کے لوگ فٹ قطر کے گھیروں میں اپنے سکوں کو پرو کر رکھتے ہیں۔ اور ایک جھونپڑی میں رکھ کر ان کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں جس طرح کہ ہمارے یہاں بینک میں کی جاتی ہے۔

جزائر ٹانگا میں کھدے ہوئے گھونگے بازو بندوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور گلوبند بھی بنائے جاتے ہیں۔ امیر آدمی کو آپ یہ دیکھ کر پہچان سکتے ہیں کہ اس نے کتنے زیادہ گلوبند اور بازو بند پہنے ہوئے ہیں۔ مالاکتا جزیرے میں بعض بہت دلچسپ سکے ہوتے ہیں۔ پہلے دو فٹ لمبے گھونگے سکے کے طور پر چلتے تھے۔ مگر اب چھوٹے گھونگوں میں سوراخ کرکے لوگ ڈوری ڈال کر گلے میں پہن لیتے ہیں۔

پروں کی کرنسی

بحرالکاہل میں عام طور پر جانوروں کی دُموں،

پرندوں کے پروں اور دریائی جانوروں کے چھلکوں کو بھی کرنسی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان پروں کو اچھی حالت میں رکھنے کے لئے بعض درختوں کی چھالوں اور گوندوں سے اس پر پالش کردی جاتی ہے۔ ان پروں کو بھی ڈوری میں پرو دیا جاتا ہے۔

آخر میں یہ بات بتانی ضروری ہے کہ اکثر جزائر بحرالکاہل میں روپے کی شکل و صورت نہیں ہوتی۔ اور سارا کام آپس کی اشیاء کے تبادلے سے ہوتا ہے۔ **مثلاً** "نیو گینیا کے بعض قبائلی صرف مچھلی پکڑ سکتے ہیں اور سبزی ترکاری حاصل کرنے کے لئے انہیں جزیرے کے دوسرے قبیلوں سے تبادلہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ غذا میں مچھلی کو شامل کرنے کے لئے اس تبادلے پر فوراً" رضا مند ہوجاتے ہیں۔ ان آسان تبادلوں میں چیزوں کی اہمیت سے ان کی قدر و قیمت کا ایک رواجی معیار قائم ہوگیا ہے۔ اور اس پر ہی عمل ہوتا ہے۔

جادو کیا ہے!

نثار احمد زبیری

انسان کی سب سے زیادہ عقل کو حیران کر دینے والی ایجاد کمپیوٹر یا خلائی جہازوں کو نہیں بلکہ جادو ٹونے کو کہا جانا چاہئے۔ اتنا اعتماد آج کے انسان کو کمپیوٹر پر نہیں ہو سکتا، جتنا اعتماد آج سے پندرہ ہزار سال قبل کے انسان کو جادو ٹونے پر اور تعویز گنڈوں پر ہو گا۔

کتنا حیرتناک دور تھا وہ بھی! چار سو پراسراریت کا ماحول، بچہ بچہ جادو کا شیدائی اور یقین رکھنے والا کہ کوئی بھی خطرہ ہو تو اسے جادو بچالے گا یا اس کا تعویز۔

جادو ٹونوں اور اس طرح کے عجیب و پراسرار حربوں کا سلسلہ انسانی تاریخ کے تقریباً ہر دور میں ملتا

ہے۔ اور انسانوں نے ان حربوں پر نہ صرف مکمل یقین رکھا ہے بلکہ انہیں اپنی ترقی دینے کی بھی کوشش کی ہے انسان نے جہاں کہیں بھی نقوش بنائے ہیں ان کی خوبصورتی، رنگ اور اثر انگیزی دیکھنے کے قابل ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان جادوئی نقوش کے رنگوں کی چمک دمک اب تک ماند نہیں پڑی ہے۔

برصغیر کے لوگ عام طور پر اجنتا اور ایلورا کے غاروں کے بارے میں جانتے ہیں .... لیکن غاروں میں قدیم زمانے کی بنی ہوئی تصویریں (خواہ کسی نوعیت اور مقصد کی ہوں) ہر جگہ ملتی ہیں۔ شاید غاروں میں رہنے کا ایک مقصد ہی یہ تھا کہ دنیا سے چھپ کر پتھروں کو تراش کر تصویریں بنائی جائیں مغربی یورپ کے بعض علاقوں میں ملنے والے ان پر اسرار اور حیرتناک نقوش کا مقصد آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکا۔

کیا ان کا تعلق انسان کی اس مستقل تمنا سے ہے کہ وہ اپنی قسمت پر قابو پاسکے؟

کیا ان کا تعلق قدیم زمانے میں پراسرار طاقتوں سے مدد لینے کے معاملات سے ہے تاکہ انسان اپنی حفاظت کرسکے۔

.... یا .... یہ محض وقت گزاری کا ایک مشغلہ تھا؟

ماہرین کے درمیان ان امور کے بارے میں اتفاق رائے نہیں ہے۔

اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔

خیال ہے کہ نی اینڈر تھل انسان نے غاروں میں تصویر کشی اور نقش گری کا سلسلہ آج سے پچاس ہزار سال پہلے شروع کیا تھا۔ ان لوگوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ "موت" کے سانحے کو قبول کرنے کا تھا۔ مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا میں ملنے والی انتہائی قدیم قبریں بڑی فنکاری کے ساتھ بنائی گئی ہیں اور مرنے والوں کے ساتھ ان کی بہت سی اشیاء مثلاً اسلحہ، کھانے پینے کی چیزیں اور پھول وغیرہ بھی رکھے گئے ہیں۔ یورپ کی قدیم قبروں میں ایک نہایت مستقل قسم کا سرخ رنگ بہت استعمال کیا گیا ہے۔ غالباً یہ رنگ زندگی کی علامت ہے جس کے استعمال کا تصور یہ ہوسکتا ہے کہ مرنے والا حیات ابدی سے سرشار رہے۔ یا اگر کسی طرح اسے دوبارہ زندگی ملے تو سرخ رنگ کی بدولت اسے سہولت ہو۔ اس سب کے باوجود قدیم انسانوں کے لئے موت کا خوف بڑی پریشانی کا باعث تھا جس کا اظہار ان کے نقوش سے ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا غاروں وغیرہ میں نقش گری کی ایک جادوئی اہمیت تھی۔ ان

نقوش کو بڑی محنت کے ساتھ خشک اور گیلے سرخ اور پیلے رنگوں سے تیار کیا گیا ہے اور ان کی تازگی بڑی حد تک، قائم ہے۔ نقش گری کے لئے برش اور نوکیلے اوزار استعمال کئے گئے ہیں اسپین میں التامیرا، فرانس میں پیش میرلے اور لسکاڈ وغیرہ میں ملنے والے ایسے نقوش کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان نقوش کے لئے غاروں کے بہت ہی اندرونی نیم تاریک اور عام نظروں سے پوشیدہ حصوں کو استعمال کیا گیا ہے۔

نقوش زیادہ تر انسانوں، اور عام استعمال کے جانورں اور مویشیوں وغیرہ کے ہیں۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ نقوش اتنی بلندی پر بنائے گئے ہیں جہاں کسی قسم کی سیڑھی یا میز وغیرہ کے بغیر پہنچنا ممکن نہیں۔ غالباً اس دور کے لوگوں نے پتھروں یا لکڑی کے کندوں پر کھڑے ہو کر یہ تصاویر ابھاری ہوں گی۔ پھر یہ سوال بڑا دلچسپ ہے کہ انہیں خفیہ مقامات پر کیوں بنایا گیا ہے؟ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان غاروں میں سے درندوں وغیرہ کو نکال کر کسی قسم کی روشنی میں، کسی پتھر پر کھڑے ہو کر بنائے جانے والے ان نقوش کو دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ انہیں بنانے والے انسان لامحدود قوت ارادی سے سرشار تھے۔ ان کے خفیہ مقامات پر بنائے جانے کے بارے میں خیال ہے کہ غالباً ان کا مقصد جادو ہو گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک دیوار پر بنی سب تصاویر ایک ہی وقت میں نہیں بنی ہیں۔ ان میں سے بعض کے درمیان اسی سال کا وقفہ ہے۔ کچھ تصاویر .... پہلے کی تصاویر کے اوپر ہی بنا دی گئی ہیں۔

کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس دور کے لوگ اپنے سائل پر قابو پانے کے خیال سے یہ تصاویر بناتے تھے۔ مثلاً جنگلی بھینسے یا گینڈے کی تصویر بنانے کا مطلب ان کی طاقت کو محدود کرنا تھا چنانچہ ایسے جانوروں کی تصاویر زیادہ تعداد میں اور بارہ سینگھے وغیرہ کی تصاویر بہت کم تعداد میں پائی گئی ہیں۔ عموماً ان تصاویر کے ساتھ ہی بنانے والوں کے بائیں ہاتھ کے نقوش بنے ہیں جن میں انگلیاں کٹی ہوئی سی لگتی ہیں۔

خفیہ مقامات پر، انتہائی مشکلات کا سامنا کر کے یہ تصاویر وغیرہ کیوں بنائی گئی ہیں............ اس کے بارے میں ماہرین بہت غور کرنے کے باوجود کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ جانوروں کی عکس کشی خاندان کے نشان کے طور پر ہے اور انہیں کسی ایسی تقریب کے موقع پر بنایا گیا ہے جب کسی گروہ نے ایک نشان رکھنے والے گروہ میں شامل ہونا قبول کیا۔ اس کے علاوہ یہ تصاویر جادوئی مقاصد کے لئے بھی ہو سکتی ہیں تاکہ شکار کھیلنے والوں کو کامیابی حاصل ہو، انہیں تصویر والے جانور یا مویشی

زیادہ تعداد میں میسر آئیں۔ اگر ان تصاویر کے ایسے ہی مقاصد رہے ہوں تو پھر یہ بھی قرین قیاس ہے کہ انہیں کسی پرومت وغیرہ قسم کے آرٹسٹ نے تیار کیا ہو گا اور اس موقع پر کوئی مذہبی نوعیت کی رسوم وغیرہ بھی ادا کی گئی ہوں گی۔ فرانس میں ملنے والے کچھ نقوش میں ایسے پرومت آرٹسٹ کی تصویر بھی موجود ہے جو انسان اور جانور کی ملی جلی کیفیات رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں، گھوڑے جیسی دم اور ریچھ جیسے پنجوں کے ساتھ وہ بہت ہی پراسرار لگتا ہے۔

ان نقوش وغیرہ کو دیکھ کر جو بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ماضی کا انسان ایک بہت ہی پراسرار ماحول میں رہتا تھا جو اس کے انداز فکر کے مطابق طرح طرح کی روحوں اور پراسرار قوتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس دور کا انسان تعویز گنڈوں اور تصاویر وغیرہ کے ذریعہ سے گویا! ان قوتوں سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کوششوں کے بغیر اس کے تحفظ کا کوئی سوال نہیں ہے۔

لیکن پھر یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ عجیب و ناقابل فہم کے جادوئی ٹوٹکوں سے ان کا علاج کس طرح ہو جاتا تھا...... ؟ مسائل کس طرح حل ہو جاتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا سب کچھ اس "یقین" سے ہوتا تھا جو وہ ان ٹوٹکوں پر رکھتے تھے۔ درحقیقت ٹوٹکوں میں کچھ نہیں تھا۔ اصل کرشمہ اس یقین کامل کا تھا جو وہ ٹوٹکے کرنے کے بعد حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ان کارروائیوں کی کئی شکلیں تھیں کئی طریقے تھے۔ مثلاً سوچنے کا ایک انداز یہ تھا کہ "جیسی تصویر وغیرہ بنائی جاتی ہے ویسا اثر ہوتا ہے" (یہی خیال علاج بالمثل کا بنیادی نکتہ ہے) ان کا دوسرا خیال تھا کہ جو چیزیں ایک بار ایک دوسرے کے رابطے میں آجاتی ہیں پھر وہ بار بار ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ یہ خیالات ان لوگوں کے ذہن میں زیادہ راسخ ہوئے جنہوں نے بحیرہ روم کے مشرقی علاقوں میں زراعت شروع کی۔ کسانوں کو شکاریوں کے مقابلے میں زیادہ حد تک استحکام حاصل تھا لیکن وہ موسموں کے بدلنے سے زیادہ متاثر بھی ہوتے تھے لہٰذا انہیں قدرتی آفات سے بچنے کی فکر زیادہ کرنی تھی جس کے لئے جادو وغیرہ کی ضرورت تھی چنانچہ مصر، یونان اور روم وغیرہ میں طرح طرح کی مذہبی رسوم کو خوب فروغ ہوا جن کا مقصد دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنا اور اس بدقسمتی سے بچنا تھا جو بیماری اور مستقبل کے خطرات کی صورت میں پریشان کن ہو سکتی تھی۔

جادو کو چار ہزار قبل مسیح عراق میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کے سمیریوں کے خیال کے مطابق زمین و آسمان کا ہر گوشہ کسی نہ کسی طرح کے دیوتا، بھوت، چڑیل، شیطان اور بدروح کا مسکن

ہے۔ بھوتوں سے بچنے کے لئے وہ ایک مشروب تیار کرتے تھے جو سرکے میں دریا، کنویں اور جوہڑ کا پانی ملا کر بیل کے سینگ میں ڈال کر پیا جاتا تھا۔ یہ مشروب پیتے وقت ایک ہاتھ میں مشعل پکڑی جاتی تھی اور دیوتاؤں کی آشرواد حاصل کرنے کے لئے منتر وغیرہ بھی پڑھے جاتے تھے۔ سمیریوں کے دور میں ہی کالے یعنی نقصان دہ جادو کا سلسلہ شروع ہوا جس نے حفاظتی جادو کی جگہ لے لی۔ دو ہزار سال قبل مسیح حمورابی کے قوانین نے ان منفی جادوئی طریقوں کو غیر قانونی قرار دیا۔

یہاں پھر وہی سوال ذہن میں آتا ہے کہ جادو کے یہ عجیب ناقابل فہم طریقے نتیجہ خیز کس طرح ثابت ہوتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ نتیجہ خیز نہ ہوتے تو انہیں بہت جلد ترک کر دیا جانا چاہئے تھا ایسے سب سوالات کا جواب وہی ہے جو پہلے آ چکا ہے۔ اصل اہمیت اس یقین کامل کی ہے جو انسان اپنے ذہن میں قائم کرتا ہے۔

میسوپوٹامیہ (عراق) کے لوگ، ہر چیز کے جادو ٹونوں میں الجھے ہوئے تھے لیکن وہ مستقبل میں بڑی دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے یہاں خوابوں کی تعبیر کو بھی ایک فن کی حیثیت حاصل تھی اس ضمن میں ان کے جانور انسان قسم کے دیوتا گل گاماش کا ایک قصہ مشہور تھا جس نے ایک انتہائی طاقتور اژدر (DRAGON) جیسے درندے کو ہلاک کیا تھا۔ گل گامش نے اس واقعہ سے قبل ایک خواب میں اپنے دشمنوں کو بڑھتے اور خود پر حملہ کرتے دیکھا تھا اور اس کی ماں نے یہ تعبیر دی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں پر قابو پالے گا اور پھر ان کے درمیان دوستی ہو جائے گی۔ یہ قصہ چار ہزار سال قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔

میسوپوٹامیہ کے دور قدیم کے لوگ جانوروں کے جگر کا "مطالعہ" کر کے پیشنگوئیاں بھی کیا کرتے تھے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کے دور میں امریکہ کی جین ڈکسن ایک شیشے کی گیند کو دیکھ کر پیشنگوئیاں کرنے کی دعویدار ہیں۔ بابلیوں کا خیال تھا کہ جگر روح کا مسکن ہے چنانچہ وہ بھیڑ کے جگر کا مطالعہ کرتے تھے اور بے شمار پیشنگوئیاں کرتے تھے۔ وہ بھیڑ کا جگر پڑھ کر یہ بتانے کی کوشش بھی کرتے تھے کہ اس کے جسم میں آنتیں موجود ہیں یا نہیں ان کا خیال تھا کہ کچھ بھیڑوں کے جسم میں آنتیں نہیں ہوتیں۔ مثلاً وہ کہتے تھے جس بھیڑ کی گردن موٹی ہو، آنکھیں سرخ ہوں اس کی آنتیں لمبی ہوتی ہیں۔ اور اس میں ۱۴ خم ہوتے ہیں اس کے برخلاف جس بھیڑ کا سائز بڑا ہو اور آنکھیں بھینگی ہوں اس کے جسم میں آنتیں نہیں ہوتیں۔

بابلیوں اور آسوریوں نے پیشنگوئی کے جو مندرجہ بالا طریقے استعمال کئے وہ تو ان کے بعد مقبول نہ رہے .... لیکن ان کا ایک طریقہ آج بھی مقبول ہے .... بلکہ آج کل اسے کچھ زیادہ ہی مقبولیت حاصل ہوگئی ہے اور وہ ہے ستاروں اور برجوں کے ذریعہ سے قسمت کا حال جاننے کی کوشش انہوں نے تین سو ساٹھ درجوں (Degrees) پر مشتمل دائرہ تیار کیا تھا جو سمیریوں کے اس تصور پر مبنی تھا کہ سال میں تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ سیارے ہر روز ایک درجہ سفر کرتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ بارہ برجوں میں داخل ہوتے ہیں یا ان سے باہر نکلتے ہیں۔ سیاروں کا یہ سفر ان کے نزدیک بھی ایک معنی رکھتا تھا ان کا خیال تھا کہ یہ سفر قسمتوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح کے تصورات کے تحت یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ ان کے ہاں ستاروں کی چال سمجھ کر قسمت کا حال بتانے والے جیوتشی اور پرومت وغیرہ ہوا کرتے تھے تاہم اس زمانے میں غالباً انفرادی زائچوں کا دور نہیں تھا۔ ان کی پیشنگوئیوں کا انداز یہ ہوتا تھا۔

اگر چاند پندرھویں دن نظر آیا تو عکاد پھلے پھولے گا اور سوبار تو بیمار ہو جائے گا۔

اگر چاند سولھویں دن نظر آیا تو عکاد اور امورو بیمار ہوجائیں گے اور سوبار تو پھلے پھولے گا۔

اگر چاند سترھویں دن نظر آیا تو عکاد اور امورو پھلیں پھولیں گے اور سوبار تو بیمار ہو جائے گا۔

(غالباً عکار د امورو اور سوبار تو دیوتاؤں کے نام تھے .... ان کے پھلنے پھولنے یا بیمار پڑنے سے مطلب یہ تھا کہ ان سے متعلقہ امور بہتر یا خراب ہوں گے) انفرادی زائچوں کا سلسلہ دو سو سال قبل مسیح مقدونیہ کے ان یونانیوں نے شروع کیا جو اسکندریہ میں آباد ہوگئے تھے اور اس کے تین سو سال بعد وہ اعتراض اٹھائے گئے جن کا تسلی بخش جواب اب تک نہیں مل سکا مثلاً ایک ہی ستارے کے اثرات کے تحت پیدا ہونے والے جڑواں بچوں کی قسمت کیسے مختلف ہوجاتی ہے؟ یا یہ کہ مستقبل کو جاننے اور سمجھنے والا ستارہ شناس خود کیسے حادثات اور قتل و غارتگری وغیرہ کا شکار ہو جاتا ہے؟ پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ ولادت کے وقت کو تو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن قیام حمل کے وقت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

اس دور جدید کے افراد کے لئے یہ سمجھنا خاص دشوار ہے کہ انسان جادو اور نادیدہ و مخفی قوتوں کے اسرار کا اتنا اسیر کیوں رہا ہے؟ ایک مصری محقق نے تقریباً پچاس سال پہلے لکھا ہے کہ پراسرار اعمال و افعال

قدیم انسانوں کی زندگی کا ایسا ہی حصہ تھے جیسے کہ غذا کھانا اور سونا وغیرہ مصر میں ان علوم کو کسی حد تک مثبت انداز میں بھی استعمال کیا گیا لیکن میسوپوٹامیہ میں ان کی منفی نوعیتوں کا زیادہ زور رہا۔ مصریوں کا خیال تھا کہ تعویز وغیرہ منفی توقوں کی قہر سامانی کا رخ اپنی طرف کر لیتے ہیں اس طرح انہیں پہننے والا محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق ہر مصری، چھوٹا بڑا مرد عورت سبھی کم از کم ایک تعویز ضرور پہنتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اسے لباس یا زیور کا حصہ بھی بنا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ مصر میں جادو اثر مشروبات کا بھی بڑا چرچا تھا۔ سب سے زیادہ مقبولیت گوبر کے بھونرے (Beetle) کی شکل کے تعویز کو حاصل تھی کیونکہ اس بھونرے کا تعلق را یعنی سورج دیوتا سے سمجھا جاتا تھا۔ مصر میں بے اولاد خواتین اس کیڑے کو خشک کر کے اس کے سفوف کا شربت نوش جاں کرتی تھیں تاکہ ان کے یہاں اولاد ہو سکے۔ مصریوں کا یہ بھی خیال تھا کہ تصاویر میں شامل انسان الفاظ کی طاقت سے زندہ ہو سکتے ہیں چنانچہ مرنے کے بعد مرنے والے کی پتھر یا لکڑی کی بنی ہوئی شبیہ بھی ساتھ رکھی جاتی تھی تاکہ آئندہ زندگی میں جب کہ اصل جسم گل سڑ چکا ہوگا پتھر یا لکڑی کی شبیہ کی مدد سے اس کے زندہ ہونے میں آسانی ہو، دیر نہ لگے۔ سیٹی اول کے مقبرے میں اس طرح کے سات سو مزدور پتلے بھی دفن کئے گئے تھے تاکہ وقت ضرورت زندہ ہو کر اپنے آقا کی خدمت انجام دے سکیں۔ مصر میں الفاظ کی جادوئی طاقت کے اظہار نے فن کی صورت اختیار کر لی تھی چنانچہ فراختہ مصر کے مقبروں میں دو طرح کی تحریریں اکثر پائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک اہرام کے اندر دعاؤں، ٹوٹکوں اور خصوصی فارمولوں کی شکل میں ہیں جب کہ دوسری ان ضروریات سے متعلق ہیں جو زندہ ہونے کے بعد فرعون کو درپیش ہو سکتی ہیں۔ ان میں غذا سے لے کر تازہ ہوا تک کی ضروریات کا ذکر ملتا ہے۔

قدیم انسانوں کے عجیب و غریب تصورات، ناقابل فہم خیالات، غاروں کے تاریک ترین حصوں میں پراسرار تصویر کشی تعویز گنڈے اور حیرت انگیز ٹوٹکوں کا احوال نہ صرف حیرتناک ہے بلکہ بے حد دلچسپ بھی ہے شاید یہ سب انسانی تہذیب کی ترقی کی منزلیں تھیں۔ ان سب منزلوں سے گزر کر بھی آج کا انسان اس مقام پر پہنچا ہے جہاں دلیل اور ثبوت اس کے رہنما ہیں۔ اگر وہ منزلیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، سمجھ لی جائیں تو آج کے انسان کی ترقی اور خصوصاً اس کی ذہنی یکسوئی کا راز سمجھ میں آجاتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

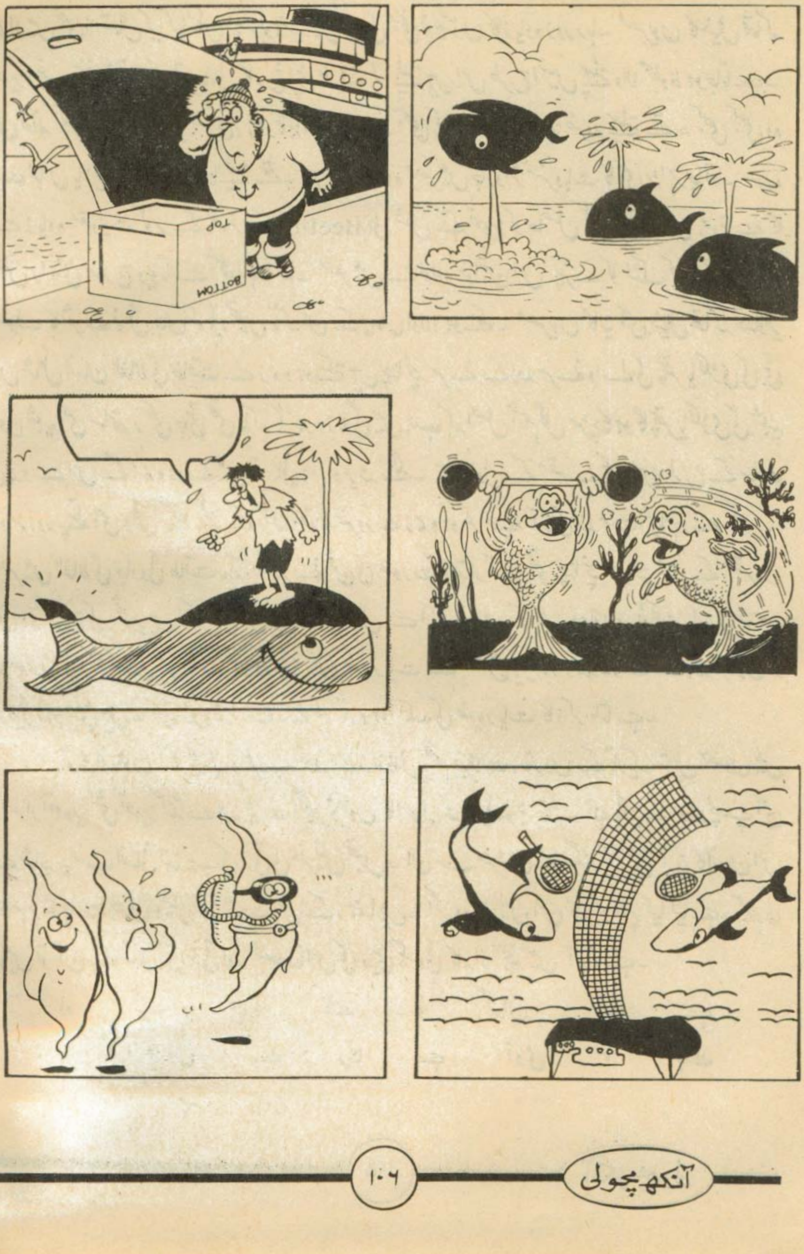
TOP
BOTTOM

پان

آغا سہیل

مشرقی پاکستان سے پان آنا کیا بند ہوئے کہ شیخ صاحب ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ کبھی اوپر کی منزل سے نیچے آتے اور کبھی صحن میں ٹہلتے، کبھی اخبار پڑھتے۔ غرض کسی پہلو قرار نہ آتا تو نکڑ کی دوکان پر جا کھڑے ہوتے، پنواڑی سے پوچھتے۔

"ارے پہلوان سناؤ کیا خبر ہے؟" اور پنواڑی مزے سے کوکا کولا کی بوتل کھولتے ہوئے کہتا۔

"میاں جی پان کا تو وہ قحط پڑا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو، بازار جاؤ تو پان والے گنڈیریاں بیچنے لگے ہیں۔ اپن بھی اب کوکاکولا بیچ رہے ہیں۔"

شیخ صاحب دونوں کمر پر ہاتھ رکھے مرثیہ سنتے رہتے پھر ایک لمبی سی لاحول پڑھتے

ہوئے چائے خانے میں گھس جاتے۔ چائے خانے میں بھی چائے سے زیادہ مقصد یہ ہوتا تھا کہ پان کی یاد دل سے کچھ تو محو ہو جائے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی باتیں سنتے رہتے کہ شاید کوئی خبر مل جائے، بلکہ خوش خبری مل جائے کہ "پان آگئے" لیکن شیخ صاحب کو تو اس نسل سے ہمیشہ سے شکایت تھی اکثر کو پانوں کے نہیں آنے سے کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ اس لئے کوئی اس موضوع پر بات بھی نہیں کرتا تھا "عجب بدمذاقی ہے۔" شیخ صاحب بڑبڑاتے ہوئے چائے خانے سے اٹھتے تو سیدھے انارکلی کے اس نکڑ پر جا پہنچتے جہاں پان والوں کا اور خریداروں کا ہجوم لگا رہتا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مگر اب وہاں بھی سخت وحشت کا عالم تھا۔ بازار سُونا سُونا اور دکانیں لٹی لٹی۔ پان والوں کی جگہ گنڈیری والے موجود۔ "یا اللہ پانوں کے بغیر یہ شہر کیسی اجاڑ نگری بنا ہوا ہے۔" شیخ صاحب بار بار سوچتے کہ کاش! وہ شاعر ہوتے تو ایک شہر آشوب لکھتے اس میں اپنا درد دل بیان کرتے اور دل کا درد تو پان تھا صرف پان۔

ایک گنڈیری والے کے پاس کھڑے ہوئے ہی تھے کہ اس نے ترازو اور باٹ اٹھا کر آواز لگائی۔ "گلاب میں بسی ہیں، قند کی ڈلی ہیں، میاں جی کتنی تولوں؟"

شیخ صاحب قدرے گھبرائے ہوئے بولے "ارے میاں یعنی اب میں اس بڑھاپے میں گنڈیریاں چوسوں گا۔"

پاس ہی کھڑے ہوئے ایک دوسرے گنڈیری والے نے یہ سن کر زندہ دلی سے آواز لگائی۔ "بوڑھا کھائے تو جوان ہو جائے، جوان کھائے تو نوجوان بن جائے ..... گلاب ہیں گنڈیریاں ....." شیخ صاحب ایک لمبی سی لاحول پڑھ کر بولے "اجی کیا سوجھی ہے تمہیں کہ پان بیچتے بیچتے ایک دم گنڈیریاں بیچنے لگے لاحول ولاقوۃ ...... بھائی کچھ پانوں کی بھی خیر خبر ہے۔"

"پان" ایک گنڈیری والا یوں زور سے ہنسا گویا شیخ صاحب نے کسی انہونی اور ناممکن الوجود شے کا ذکر کیا ہو۔ دوسرا ان کے سامنے زوروں سے ہاتھ نچا کر بولا۔ "میاں کیمرہ ہو تو پان کی تصویر اتار لو، فریم کرا کے پاندان میں لگا لو، اب نہیں آنے کا ادھر پان ..... گنڈیریاں نہ بیچیں تو کیا کریں، بچوں کا پیٹ کیسے پالیں؟" شیخ صاحب نے تائید میں گردن ہلائی، ایک لمبی سی گہری آہ بھری اور کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو بھائی! شریف آدمی تو ہاتھ پھیلا کر بھیک بھی نہیں مانگ سکتا۔"

یہاں سے جو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے

چلے تو سیدھے بھاٹی دروازے پر پہنچے اور اپنی بیوہ بھاوج کو یہ اہم ترین خبر سنائی کہ "لو بی! اب تو قیامت کے آثار ہیں کہ پان داتا کی نگری میں عنقا ہے، اب قیامت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ پہلے ہی اس شہر میں پانوں کی کون سی ریل پیل تھی، ایک اور آدھے آدھے پان کی گلوری کھاتے تھے۔ تلے اوپر چار چار چھ چھ پانوں کے بیڑے تو مدت سے نصیب نہ ہوئے تھے کہ لیجئے اب یہ صورت ہے کہ پان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے۔"

بیوہ بھاوج جس نے زندگی بھر مصیبتیں جھیل جھیل کر بچے پالے تھے۔ شوہر سے کسی شے کی کبھی فرمائش نہ کی تھی نہ اچھا کھانا نہ کپڑا لیکن پان اور پاندان سے ایسا تعلق تھا کہ ہر غم اسی سے غلط ہوتا تھا۔ کبھی چھالیا رات رات بھر کتری جا رہی ہے، گلوریوں پر گلوریاں ہیں کہ کھائی جا رہی ہیں، کبھی کتھے کے جمانے کا مشغلہ درپیش ہے، تو کبھی چونے کو چکنا رکھنے کے لئے دودھ اور دہی کا توڑ ڈالا جا رہا ہے، کبھی زعفرانی قوام اور ورقی گولیاں ہیں، کبھی لکھنؤ کا مشکی تمباکو غرض کہ مزے سے گزرتی رہی مگر پانوں کا قحط اس کے لئے بھی سانحۂ عظیم تھا، بولی :

"بھائی سنا ہے کہ کراچی والے تو پالک کے پتے کھا رہے ہیں۔"

شیخ صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی، بولے ...... "بی! ہم بیل بکری تو نہیں کہ پالک چرنے لگیں۔ ابھی تک پان اور سبزی میں تمیز کر سکتے ہیں۔ یاد ہے مہوبے کا پان، بنارسی پان، دسہوری پان اور سندیلے پانوں کی ڈھولیاں آتی تھیں۔"

"اے ہے اب وہ وخت (وقت) کاہے کو آئے گا...... کیا کیا بہاریں تھیں پان کی بھی۔"

"پستی پان تو لوگ یہاں جانتے بھی نہیں۔ واہ کیا خستگی ہوتی تھی زعفرانی قوام اور ورقی گولیوں سے کھاؤ تو وہ لعاب بنتا تھا کہ کیا کہنا :"

"بھئی اب جی نہ جلاؤ بھابی یہ ذکر کر کر کے، لاؤ کچھ چھالیہ ہی کھلاؤ۔"

"خشک چھالیہ تو منہ میں آبلے ڈال دیوے ہے بھیا، میں نے تو کھوپرا اور سونف ڈال کر گوٹہ بنالیا ہے۔"

گوٹے کا پھنکا مار کر شیخ صاحب بولے "نو بہار گوٹہ بھی خوب ہوتا تھا...... لاؤ بھابی ذرا میرا بٹوہ تو بھر دو، اللہ جنت نصیب کرے مرنے والی کو، آج زندہ ہوتی تو مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔" شیخ صاحب اپنی مرحومہ زوجہ کو یاد کر کے اب جو یہاں سے چلے تو سیدھے پنجاب پبلک لائبریری

کے ریڈنگ روم میں دم لیا۔ خبریں تو آج کل بہت ہوتیں، بھانت بھانت کی ہوتیں اور گرما گرم رنگ رنگ کی ساری دنیا کی خبریں۔ لیکن جس خبر کو شیخ صاحب ہر اخبار کے ہر صفحہ کے ہر کالم میں تلاش کرتے وہ کہیں نہ ملتی، جھنجلا کر گھر چلے آتے۔ کھانے سے فراغت ہوتی تو پھر پان کی یاد آجاتی۔ غرض کہ کسی طرح غم غلط نہ ہوتا تو بڑی بہو کے کمرے میں جانکلتے اور ریڈیو کی خبروں کے بارے میں پوچھتے اور کبھی شام کو ٹیلی ویژن سے خبریں سنتے کہ یاالٰہی اب تو خبر آجائے پان کی، لیکن ایسی خبروں کو بھی ضد ہوتی ہے نہ آنا تھی نہ آئی۔

اور شیخ صاحب بدستور پانوں کی جدائی میں سارے شہر میں گھومتے رہتے لیکن پان کے نام پر پتی بھی میسر نہ آتی۔

ایک روز شیخ صاحب نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں ہزاروں روپیہ کا پان کسٹم والوں نے پکڑا اور اسے روند روند کر پھینک دیا اور جلا دیا۔ "ہائے ہائے ظالمو! کیا تم میں کوئی اہل دل اور اہل درد نہ تھا کہ اس ستم سے باز رہتا۔ یار وہ پان اگر ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا تھا اور خلاف قانون تھا تو لانے والوں کو شوق سے سزا دیتے پانوں کا کیا قصور تھا؟ ارے ہم جیسے لوگوں کے لئے تو پان کا عرق بھی آب حیات ہے، بھائیو! ہم پیاسوں کے حلق میں ذرا سا ٹپکا دیتے کہ روح تازہ ہوجاتی اور جان میں جان آجاتی۔"

شیخ صاحب کو اس لیڈر پر بڑا رشک آیا جو ڈھاکہ محض اس لئے گیا تھا کہ وہاں پان کھا سکے۔ کہتے ہیں کہ ڈھاکے کے لیڈروں سے گفتگو میں تو وہ لیڈر سرخرو نہ ہوسکا، لیکن پان کے بیڑوں سے ایسا سرخ رو ہو کر آیا کہ جس اخباری نمائندے نے کوئی سوال کیا جھٹ پان کی گلوری بڑھا کر اسے ایسا بے خود کیا کہ وہ ساری چوکڑی بھول گیا۔ شیخ صاحب کفِ افسوس ملتے کہ سرکاری دفتروں میں بلاوجہ عمر گزاری، صحافی بنے ہوتے تو کم از کم کسی لیڈر ہی کے طفیل پان میسر آجاتے۔

ایک دن کسی نے شیخ صاحب کو خوش خبری سنائی کہ گلبرگ میں ایک نیا رئیس حضرت امام حسینؓ کی مجلس منعقد کرتا ہے۔ تبرک کے طور پر کھانا وغیرہ تو کھلاتا ہی ہے، پان کی گلوریوں پر گلوریاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ سینکڑوں گلوریاں لوگ کھا جاتے ہیں۔ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ شیخ صاحب نہ پسیجتے "فوراً" مجلس میں جاپہنچے اور جو کچھ سنا تھا آنکھوں سے دیکھ لیا بلکہ منہ میں جس قدر سما سکتی تھیں گلوریاں بھرلیں۔ نگاہیں بچا کر دو چار گلوریاں بٹوے میں رکھ لیں اور سیدھے اپنی بہو

بھاوج کے پاس پہنچ گئے بولے۔"لو بھئی دیکھو ایسی نعمت لے کر آیا ہوں کہ دل سے دعائیں دو گی"۔ یہ کہا اور شیخ صاحب نے گلوریاں نکال کر بھاوج کو دیں۔ وہ باغ باغ ہو گئیں، ہزاروں دعائیں دیں۔

شیخ صاحب دوسرے روز بھی مجلس میں جا پہنچے اور بدستور پان خوب کھائے۔ پانوں کی لذت اور حلاوت بھی خوب تھی اور وہ معطر بھی تھے۔ لوگ مزے لے لے کر پان کھا رہے تھے کہ اچانک کچھ سرکاری کارندے پہنچے اور پانوں پر قبضہ کر کے رئیس سے سخت لہجے میں سوال جواب کرنے لگے۔ انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ "ہندوستان سے اسمگل شدہ پان روزانہ آپ کے گھر پہنچ رہے ہیں۔ آپ پر دفعہ .... کے تحت مقدمہ قائم کیا جاتا ہے۔"

رئیس کا جو حال ہونا تھا ہوا شیخ صاحب ایسے بدحواس ہوئے کہ فوراً" اپنی بیوہ بھاوج کے یہاں جا پہنچے بے خیالی میں انہیں یہ خیال بھی نہ رہا کہ پان کی گلوریاں منہ کی منہ میں دھری تھیں اور جیب کی جیب میں۔ انہیں جو بھاوج نے دیکھا پانوں کی توقع میں کھل اٹھیں لیکن شیخ صاحب کے بجھے ہوئے مایوس چہرے کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ پوچھا "خیر تو ہے کیا آج پان نہیں ملے؟"

- زمین کی جنّت کشمیر (پاکستان) کو کہتے ہیں۔
- فرانس کی دلہن پیرس (فرانس) کو کہتے ہیں۔
- صحرا کا چمن ایتھوپیا (افریقہ) کو کہتے ہیں۔

شیخ صاحب نے نفی میں گردن ہلائی اور جیب سے بٹوہ نکال کر پانوں کی گلوریاں ہتھیلی پر رکھ لیں۔

ان کے ذہن میں بس ایک جملہ گونج رہا تھا کہ "ہندوستان سے اسمگل شدہ پان روزانہ آپ کے گھر پہنچ رہے ہیں۔"

بھاوج نے ہاتھ بڑھا کر گلوریاں اٹھانا چاہیں تو شیخ صاحب نے مٹھی بھینچ کر گلوریاں مسل ڈالیں، بھاوج کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شیخ صاحب نے منہ میں دبی ہوئی گلوریاں بھی تھوک دیں۔ گلاس میں پانی لے کر خوب کلی کی، بھاوج نے کہا۔"یا اللہ خیر! کہیں گلوریوں میں زہر تو نہیں تھا؟"

شیخ صاحب نے ہاں میں گردن ہلائی اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں پر رومال رکھ لیا، چھڑی اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ بھاوج حیرت کے مارے منہ کھولے بس دیکھتی رہ گئیں۔

●●

پیاری بہنا

مراد هاشمی کراچی

اہت کے پاکیزہ رنگ
سنا تیرے پیار کے سنگ
یک ترا ہے پیار جسے
ھی نہیں لگتا ہے زنگ
ری مخلص چاہت پر
بے خود رہتے ہیں دنگ
جائے خوش رنگ گلاب
ری راہ کا ہر اک سنگ
ئے رنگ حقیقت کا
ی ہر معصوم امنگ
ی کا ناز نہ کم ہوگا
ہے رہے دنیا سے جنگ

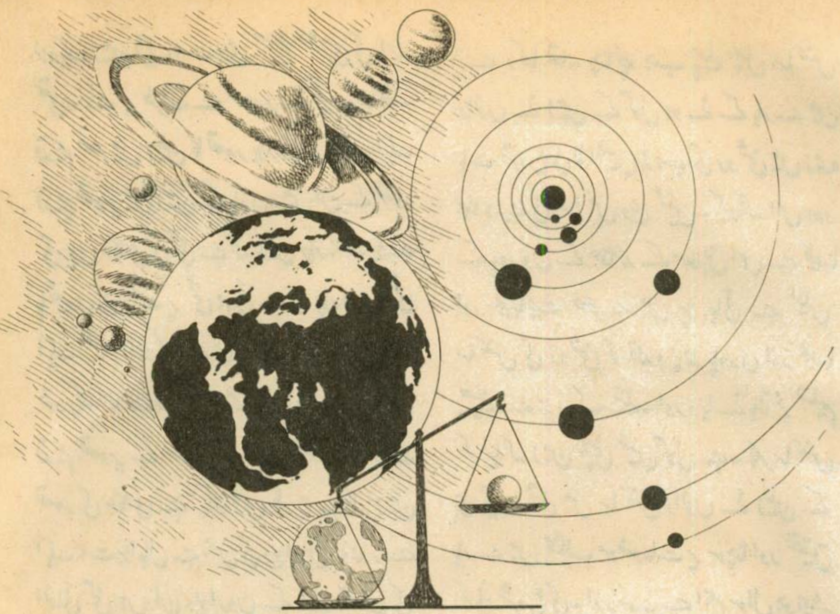

ہماری زمین، پیاری زمین

عبدالستار رحمان طاہر

زمین جی ہاں زمین..... جس پر ہم سب رہتے ہیں۔ جس پر ہم چلتے پھرتے، گھومتے اور سارے کاروبار زندگی سرانجام دیتے ہیں۔ اور جس کی گود ہی ہماری آخری قیام گاہ ہوگی۔ انسان نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت سے وہ زمین کو دیکھ رہا ہے اور اس کے بارے میں جاننے کی بھرپور کوشش بھی کر رہا ہے۔ زمین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش انسان نے اس وقت بھی کی جب وہ ابھی وہمی اور تخیلاتی زیادہ تھا اس زمانے میں بھی اس نے زمین کے بارے میں نظریات قائم کیے، تصورات کے عالم میں اس کی عجیب و غریب شکلیں اور صورتیں وضع کیں۔ دنیا کے مختلف اور دور افتادہ خطوں پر بسنے والی قدیم قوموں کے ہاں زمین کے بڑے عجیب و غریب لیکن دلچسپ تصورات، عقائد اور نظریات پائے جاتے تھے۔ قدیم یونانیوں کے

نزدیک زمین ایک بہت بڑی مسطح طشتری کی مانند تھی۔ جسے ہر طرف سے سمندر نے گھیر رکھا تھا۔ قدیم مصر میں زمین کا تصور بڑا دلچسپ تھا۔ ایک قدیم تصویر میں زمین کے بارے میں ان کے تصور کی یوں عکاسی کی گئی ہے کہ زمین چار بہت بڑے ہاتھیوں کی پشت پر ٹکی ہوئی ہے یہ چاروں ہاتھی ایک عظیم الجثہ کچھوے کی پشت پر کھڑے ہیں اور خود کچھوا لامحدود سمندر میں تیر رہا ہے ایک اور قدیم تصویر کے مطابق جو کسی نامعلوم قوم کے تصور کی عکاسی ہے، کچھ اس طرح ہے کہ زمین ایک بہت بڑا ہال ہے جس کی دیواریں سمندر سے اٹھائی گئی ہیں ان دیواروں کے اوپر آسمان کی چھت پڑی ہوئی ہے۔ ہمارے اپنے ہاں زمین کا یہ خوبصورت تصور تو دیہات میں اب بھی قائم ہے کہ زمین ایک بہت بڑے دیو ہیکل بیل یا گائے نے سینگ پر اٹھا رکھی ہے۔ اسی حوالے سے زلزلے کے بارے میں ہماری بڑی بوڑھیاں بتایا کرتی تھیں کہ گائے کا جب ایک سینگ تھک جاتا ہے تو وہ زمین کا بوجھ دوسرے سینگ پر اٹھا لیتی ہے۔ اس سے زمین ہل جاتی ہے اور زلزلہ آتا ہے۔ زمین کے بارے میں چپٹی (FLAT) ہونے کا تصور تو صدیوں تک قائم رہا بلکہ مذہبی عقائد کی روشنی میں بھی اسے کلیسا (CHURCH) نے چپٹا (FLAT) ہی قرار دے رکھا تھا۔ چنانچہ جب پہلے پہل سائنس دانوں نے زمین کے گول ہونے کے بارے میں بات شروع کی تو انہیں مذہب کی روشنی میں زندہ جلا دینے کی سزائیں دی گئیں۔ کیونکہ اس دور کے پادریوں کے عقائد کے مطابق اس سے کلیسا اور عیسائیت خطرے میں پڑ جاتی ہے لیکن سائنس کی روشنی کو تشدد پسند پادری اور کلیسا پھیلنے سے نہ روک سکے۔ اور دنیا نے بالآخر تسلیم کر لیا کہ زمین چپٹی نہیں گول ہے۔ پھر سائنس ہی کی روشنی میں سائنس دانوں نے زمین کے بارے میں مختلف موضوعات پر سوچنا اور تحقیق کرنی شروع کی۔ اور سب سے اہم سوال جو ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا اور اب بھی ہے۔ وہ یہ تھا کہ زمین کس طرح معرض وجود میں آئی اس سلسلے میں مختلف سائنس دانوں نے مختلف اوقات میں مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ آیئے باری باری ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام پر ایک فرانسیسی ہیت دان اور ریاضی دان پیری سائمن لیپلیس (LAPLESS PARY SYMEN) نے ایک نظریہ پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارا نظام شمسی زمین سمیت ایک عظیم سحابیئے (NEBULA) سے وجود میں آیا۔ یہ سحابیہ گردش کے دوران سرد ہو کر سکڑنا شروع ہوا تو اس میں سے گیس کے بڑے

بڑے ٹکڑے الگ ہوگئے جو مزید سرد ہو کر اور سکڑ کر سورج، زمین اور دیگر سیاروں کی شکل اختیار کر گئے۔ انیسویں صدی کے قریب پروفیسر ٹی سی چیمبر لین نے اس نظریئے کو ناقابل یقین قرار دیا اور اس کے مقابلے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ "پروفیسر ٹی۔ سی۔ چیمبرلین کے نظریئے کے مطابق ایک عظیم الجثہ سیارہ گردش کرتا ہوا کھربوں سال پہلے سورج کے قریب سے گذرا۔ اس سیارے کی بے پناہ کشش کی وجہ سے سورج کے اپنے پگھلے ہوئے وجود سے بہت سے ٹکڑے الگ ہوگئے اور سورج کی کشش کے زیر اثر اسی کے گرد گردش کرنے لگے اور سیارے بن گئے۔ انہی میں ہماری زمین شامل تھی۔" اس نظریے پر بھی بہت سے اعتراضات ہوئے۔ اعتراض کرنے والوں میں سر جیمز جینز خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن انگلستان کے ممتاز ہیئت دان ہیرلڈ جیفرے نے اس کی تائید کی اور اس تھیوری کو دیگر نظریات کے مقابلے میں زیادہ قرین قیاس اور قابل قبول قرار دیا۔ اس تھیوری پر اعتراض کرنے والوں نے جو سب سے بڑا اعتراض کیا وہ یہ تھا کہ اگر زمین اور دیگر سیارے سورج سے وجود میں آئے تو پھر خود سورج کہاں سے وجود میں آیا؟ اس سوال کا حتمی جواب ابھی تک انسان کو نہیں مل سکا۔ تیسری تھیوری جو جیولاجیکل تھیوری کہلاتی ہے، کے مطابق کسی وجہ سے سورج کی جلتی ہوئی گیسوں سے مختلف حلقے الگ ہوگئے۔ اور سورج کے گرد گردش کرنے لگے۔ پھر یہ گیس بتدریج ٹھنڈی ہوتی گئیں۔ بھاری چیزیں نیچے بیٹھتی گئیں اور ہلکی چیزیں اوپر آگئیں۔ اسی طرح نہ صرف ہماری زمین بلکہ دیگر سیارے بھی معرض وجود میں آئے۔ اب تک جتنے نظریات پیش ہوئے ہیں۔ ان میں یہی نظریہ زیادہ مقبول ہے اور قرین قیاس بھی۔ کیونکہ زمین کی اپنی ساخت اس کی تائید کرتی ہے کہ زمین کی گہرائیوں میں وزنی معدنیات اور چٹانوں کا ذخیرہ ہے اس کے اوپر کی تہوں میں نسبتاً" ہلکی چیزیں ہیں۔ گیسوں (GASES) سے ہوا کا کرہ تخلیق ہوا اور ہواؤں کے ملاپ سے بادل اور پانی وجود میں آئے اور اسی سے سمندر (SEA) بنا۔ سمندر کے بارے میں بھی، خاص طور پر بحرالکاہل کے بارے میں ایک دلچسپ نظریہ یہ ہے کہ جس وقت زمین ابھی پگھلے ہوئے مادے کی شکل میں تھی اور بڑی تیزی سے فضا میں گردش کر رہی تھی تو اس کا ایک بہت بڑا ٹکڑا الگ ہو کر فضا میں نکل گیا لیکن زمین کی کشش کی وجہ سے اس کے گرد گردش کرنے لگا۔ اس ٹکڑے کو ہم چاند کہتے ہیں اور زمین کا وہ حصہ جہاں سے چاند الگ ہوا تھا، بحرالکاہل کہلاتا ہے۔ سائنسدانوں نے چاند کی جسامت اور بحرالکاہل

کے رقبے کا حساب بھی لگا کر دیکھا جو قریب قریب برابر ہے یہ نظریات تو رہے ایک طرف لیکن ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ آخر زمین کو وجود میں آئے کتنی مدت، گزر چکی ہے۔ اس سلسلے میں بھی سائنس دانوں نے بہت تحقیق کی ہے اور اس ضمن میں انہوں نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ پروفیسر جان جول نے اس سلسلے میں ایک حساب لگایا کہ سمندر (SEA) میں عام طور پر دریاؤں کے نمک لاکر پھینکنے کی رفتار کیا ہے۔ پھر انہوں نے کل سمندری نمک کا حساب نکالا اور اس سے نتیجہ اخذ کیا کہ اتنا نمک سمندر تک پہنچنے میں کتنا عرصہ لگا ہوگا اسی کو انہوں نے زمین کی عمر قرار دیا۔ جو ان کے حساب کے مطابق نو کروڑ سال لگے ہوں گے۔ ایک اور معدنیات کے ماہر نے زمین کی عمر دریافت کرنے کا ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کیچڑ سے چٹان بننے تک کے عرصے سے زمین کی عمر دریافت کی جو اس کے حساب سے دس کروڑ سال بنتی ہے۔ ایک اور سائنس دان لارڈ کیلون نے اس طریقے سے حساب لگایا کہ زمین کے خول کے سرد ہونے میں کتنا عرصہ لگا ہوگا۔ اور اسی سے اس نے زمین کی عمر کا تعین کیا۔ اس کے حساب سے زمین کی عمر دس کروڑ سال بنتی ہے،دور جدید میں ریڈیم کے دریافت کے بعد چیزوں کی عمریں دریافت کرنے کا ایک سائنٹیفک لیکن پر پیچ عمل ایجاد ہوا۔ اس کے ذریعے زمین کی عمر کا حساب لگایا گیا۔ اس کے مطابق زمین کی عمر ایک ارب اسی کروڑ سال سے لے کر تین ارب سال کے درمیان قرار پائی ہے۔ یہ عمر ان تمام عمروں سے زیادہ ہے جو اب تک دیگر قاعدوں کے ذریعے سائنس دانوں نے نکالی ہیں۔ اور غالباً" یہ زیادہ سائنٹیفک اور قرین قیاس اندازہ ہے۔ پہلے اندازے اس لئے بھی قابل قبول نہیں ہیں کہ ان کے مطابق یوں لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ ایک دم ہوگیا تھا۔ حالانکہ حقیقتاً" ایسا نہیں،مثال کے طور پر سمندری نمک کے ذریعے جو حساب لگایا گیا وہ اس لئے بھی غلط ہے کہ سمندروں کی تخلیق سے بہت پہلے بھی زمین وجود میں آچکی تھی۔ پھر زمین کی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں نہ صرف سمندروں کی نوعیت کو بدلتی رہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے سمندر میں نمک پہنچنے کی رفتار کبھی بھی یکساں نہیں رہی ہوگی چنانچہ زیادہ صحیح اور قابل قبول حساب وہی ہے جو تابکاری کے ذریعے لگایا گیا ہے۔

نظام شمسی میں زمین کی حیثیت

زمین سورج کے کنبے یعنی ہمارے نظام شمسی کی ایک ممتاز رکن ہے اس لئے بھی کہ یہ واحد

کرہ ہے جس پر حیات پائی جاتی ہے۔ دیگر سیاروں مثال کے طور پر مریخ اور زہرہ کے بارے میں جو یہ خیال ہے کہ وہاں بھی زندگی موجود ہے ابھی تک محض ایک نظریہ (THEORY) ہے جس کے حق میں بھی اور خلاف بھی بیسیوں دلائل دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام تر دلائل کے باوجود ابھی تک ان سیاروں پر حیات کے کوئی واضح اثرات نہ تو ملے ہیں اور (بہت سے سائنس دانوں کے مطابق) نہ ہی اس کا کوئی امکان ہے۔ سورج کی طرف سے گنتی کریں تو زمین تیسرا سیارہ ہے۔ اور کل سیاروں میں اس کا نمبر جسامت کے اعتبار سے پانچواں ہے یہ سورج کے گرد ایک سال یعنی ۱/۴ ۳۶۵ دنوں میں اپنا چکر پورا کرتی ہے۔ اس گردش کو سالانہ گردش کہتے ہیں۔ جس فرضی بیضوی دائرے میں یہ سورج کے گرد چکر لگاتی ہے اسے زمین کا مدار کہتے ہیں۔ زمین کی دوسری گردش اس کی اپنی گردش یعنی محوری گردش ہے زمین یہ چکر تقریباً" چوبیس گھنٹوں میں لگاتی ہے اور اسی گردش کے نتیجے میں دن اور رات وجود میں آتے ہیں۔ زمین سورج کے نزدیک تر جنوری میں آتی ہے اس وقت سورج سے اس کا فاصلہ نو کروڑ تیرہ لاکھ میل ہوتا ہے۔ سورج سے دور تر یہ جولائی میں ہوتی ہے اس وقت اس کا سورج سے فاصلہ ۹۴،۵۰۰،۰۰۰ (نو کروڑ پینتالیس لاکھ) میل ہوتا ہے۔

زمین گول ہے:

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زمین گول ہونے کا سب سے پہلا اعلان کوپر نیکس (COPERNICUS) نے کیا۔ حالانکہ تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانی فلاسفر کوپر نیکس سے بہت پہلے زمین کے گول ہونے کا ثبوت بہم پہنچا چکے تھے سکندر اعظم (یونان کی ایک ریاست مقدونیہ کا حکمران) کے عہد کے ایک عالم اراتوس تھیس نے حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے ۲۵۰ (دو سو پچاس) سال قبل ہی زمین کے محیط کا حساب لگالیا تھا۔ اگر ہمیں اس عہد کے قدیم یونانی پیمانے معلوم ہوجائیں تو گمان غالب یہی ہے کہ اس عظیم یونانی سائنس دان کا حساب بڑی حد تک درست ہوگا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زمین گول ہے تو اس سے مراد زمین کا گیند کی طرح گول ہونا نہیں ہوتا۔ زمین قطبین پر کسی حد تک چپٹی (FLAT) ہے جیسے نارنگی ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت ان تصاویر سے بھی ہوتا ہے جو خلائی جہازوں کے ذریعے آج کے دور میں جدید ترین کیمروں کے ذریعے اتاری گئی ہیں۔ ان تصاویر کے مطالعے سے بھی زمین کے قطبین پر چپٹے ہونے کا ثبوت مل گیا ہے۔

خانہ کعبہ

- خانہ کعبہ پانچ پہاڑوں کے پتھر سے تعمیر کیا گیا۔
- خانہ کعبہ کی دیوار کا رنگ بھورا ہے۔
- خانہ کعبہ کی چھت میں اتنی قندیلیں ہیں۔
- خانہ کعبہ کرہ ارض کا مرکز تصور کیا جاتا ہے

زمین کا وزن :

زمین کے بارے میں سائنس دانوں نے جو دل چسپ دریافتیں کی ہیں۔ ان میں زمین کا وزن بھی شامل ہے یہ معرکتہ الاراء کام ۴۲-۱۹۴۱ء میں مشہور سائنس دان ڈاکٹر پال آر ہیل نے سر انجام دیا۔ انہوں نے پنڈولم یا رقاص کی مدد سے یہ کام کیا۔ انہوں نے ریاضی کے قاعدوں کے سے حساب لگا کر بتایا کہ زمین کا وزن ۱۰x۶ کلو گرام (5.95 x 10 کلوگرام) ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیئے کہ زمین کا کل وزن ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۵۷۰،۶ ٹن یا (۱۰x ۶۵۷) ٹن ہے)

زمین کا خاتمہ کب اور کس طرح ہو گا؟

سائنسدانوں نے حساب لگایا ہے کہ زمین کی گروش کی رفتار میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس حساب سے اگر برابر کمی ہوتی رہی تو ایک وقت آئے گا جب زمین کی رفتار بالکل ختم ہو جائے گی اور نتیجے کے طور پر یا تو کھنچی ہوئی سورج میں چلی جائے گی یا پھر دور خلا میں تیرتے ہوئے کسی عظیم سیارے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوئیں تو زمین کی اپنی گردش رک جانے کے باعث نہ صرف سورج کے گرد صرف اسی طرح چکر لگانے کے لئے رہ جائے گی۔ جس طرح چاند ہماری زمین کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور یوں زمین کا ایک نصف ہمیشہ سورج کی طرف رہے گا اور دوسرا نصف ہمیشہ سورج سے اوجھل رہے گا۔ اس کے نتیجے میں سورج کے سامنے والے حصے پر اس شدت کی گرمی پڑے گی کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا اور الٹی طرف اتنی شدید سردی اور اندھیرا ہو گا کہ ہر شے کا وجود ختم ہو جائے گا اور کچھ بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔ زمین کا یہ انجام ابھی بہت دور ہے۔ اس انجام تک پہنچنے کے لئے کروڑوں بلکہ اربوں سال لگیں گے۔ کیونکہ زمین کی محوری گردش میں ایک لاکھ پچاس ہزار (۱۵۰۰۰۰) سال میں صرف ایک سیکنڈ کی کمی واقع ہوتی ہے۔

قلم دوست

روشنی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے
ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم
اس شخص کی طرف دیکھو جو تم سے کم تر درجے
میں ہے۔ اس کی طرف نہ دیکھو جو تم سے اعلیٰ
درجے میں ہے۔ اس سے یہ کیفیت پیدا ہو گی کہ
تم اللہ کی نعمت کی ناشکری نہیں کرو گے۔

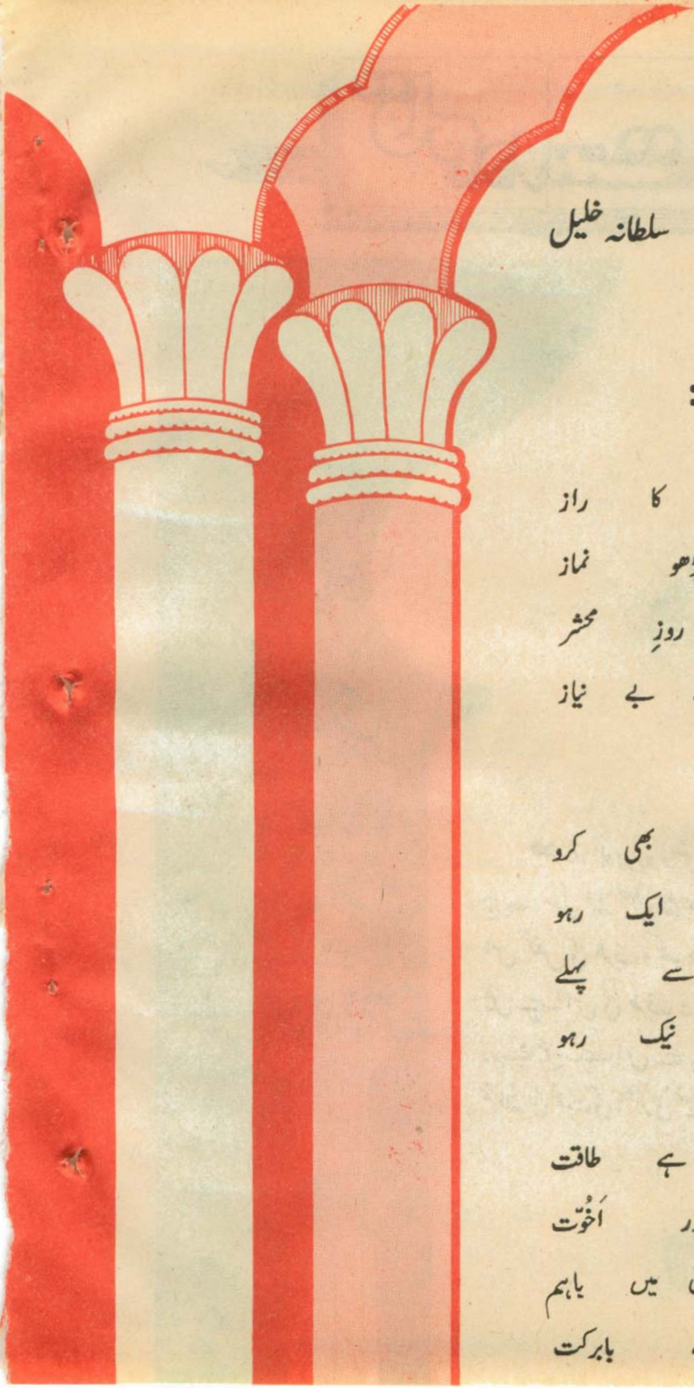

سنہری باتیں

سلطانہ خلیل

پیارے نبیؐ نے یہ فرمایا :

جنّت کو پانے کا راز
روزہ رکھو ، پڑھو نماز
پھل پاؤ گے روزِ محشر
اللہ سب سے ہے بے نیاز

کہتے ہو جو خود بھی کرو
قول و عمل میں ایک رہو
نیکی پھیلانے سے پہلے
اپنے عمل میں نیک رہو

ہم مُسلم کی ہے طاقت
پیار محبت اور اُخُوّت
یک جہتی ہو جس میں باہم
کام وہی ہے بابرکت

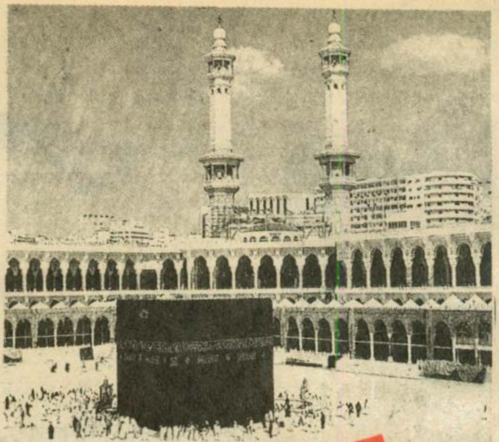

خدا کہاں ہے؟

ایک دفعہ ایک انگریز کرنل ہندوستان ٹھہرا۔ وہ مسلمانوں کے اس جذبے پر حیران ہوا کہ وہ ایک ان دیکھے خدا کی عبادت کرتے ہیں چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ جو مجھے بتائے گا کہ اللہ کہاں ہے۔ تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ اس نے علمائے دین اور بزرگوں سے کئی دلیلیں سنیں لیکن اسے کوئی متاثر نہ کر سکا۔ پھر لوگوں نے اس سے کہا کہ تم علامہ اقبالؒ کے پاس جاؤ، وہ تمہیں بتائے گا کہ خدا کہاں ہے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے پاس گیا اور ساری بات کہہ سنائی۔ اقبالؒ نے فرمایا "چند دن بعد آنا۔" چند دنوں بعد وہ آدمی آیا تو اقبالؒ نے فرمایا کہ میں اقبال نہیں ہوں اور اقبال تو کوئی اور ہے۔ وہ آدمی بڑا حیران ہوا اور واپس چلا گیا۔

لیکن پھر لوگوں سے پوچھ پوچھ کر اقبالؒ کے پاس دوبارہ آگیا۔ تو اقبال رحمۃ علیہ نے فرمایا۔ "میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میں اقبال نہیں ہوں۔" انگریز بولا کہ آپ ہی اقبال ہیں۔ علامہ نے پوچھا "تم سے کس نے کہا ہے کہ میں اقبال ہوں۔" تو انگریز نے جواب دیا" سب لوگ کہتے ہیں۔" آپ نے کہا "کمال ہے کچھ لوگوں کے کہنے پر تم نے مان لیا کہ اقبال میں ہوں۔ اگرچہ میں نے اس سے انکار بھی کیا پھر بھی تم اڑے رہے، لیکن ساری دنیا کے کہنے کے باوجود کہ خدا کا وجود ہے، تم اس کے منکر ہو۔" انگریز اس جواب سے بہت متاثر ہوا اور آپ کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا۔

ببلی

رافت محمود، جہلم کینٹ

"ببلی" ایک چھوٹی سی بچی کا نام تھا جس کی عمر تقریباً پانچ سال تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اکیلی خط پوسٹ کرنے کے لئے جا رہی تھی۔ اس کی امی اور نانی اماں اسے چھوڑنے کے لئے دروازے تک آئی تھیں۔ وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر آگے چل پڑی۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اسے دودھ والا مل گیا۔ دودھ والے نے پوچھا۔ "ببلی! تم کہاں جا رہی ہو؟" تو ببلی نے خوش ہو کر جواب دیا کہ "میں آج پہلی مرتبہ خط پوسٹ کرنے جا رہی ہوں۔" اس نے یہ کہا اور آگے چل پڑی۔ تھوڑی دور جا کر اسے آنٹی مل گئیں۔ اس نے انہیں ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر پوچھا کہ "امی اور نانی اماں کے بغیر کہاں جا رہی ہو؟" تو ببلی نے فوراً جواب دیا کہ "میں پہلی دفعہ اکیلی خط پوسٹ کرنے جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑی ڈاک خانہ وہاں سے تھوڑی ہی دور تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی ڈاک خانے تک پہنچی لیکن جب اس نے خط ڈالنے کی کوشش کی تو..... اف، اس کا قد تو پوسٹ بکس تک پہنچتا ہی نہیں تھا۔ یہ سوچ کر وہ بہت پریشان ہوئی اس نے سوچا کہ اب اگر میں ایسے ہی گھر چلی گئی تو سب یہ سوچیں گے کہ میں چھوٹی ہوں اور اسے یہ کسی طرح برداشت نہ تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ گڈو انکل سے مشورہ کیا جائے۔ گڈو انکل کا گھر ڈاک خانے کے بالکل پاس تھا۔ وہ گڈو انکل کے گھر چلی گئی۔ آخر کار انکل نے مسئلے کا حل نکال ہی دیا۔ ان کے صحن میں ایک لکڑی کا ڈبہ پڑا ہوا تھا۔ ببلی اسے باہر لے گئی اور اس پر کھڑے ہو کر خط پوسٹ بکس میں ڈال دیا۔ اب وہ بہت خوش تھی۔ اس نے انکل کا ڈبہ واپس کیا، ان کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی گھر کی طرف چل پڑی۔

عظیم سوچ

محمد ندیم اختر

عائشہ میٹرک کی طالبہ تھی۔ وہ بہت زیادہ ذہین' ایماندار اور حساس لڑکی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوچکی تھیں اور وہ اپنے انکل کے ہاں جانے کی ضد کررہی تھی۔ اس کے انکل ملتان میں رہتے تھے۔ آخر جمعہ آپہنچا اور کچھ ضروری سازو سامان کے ساتھ اسلام آباد سے ملتان کی طرف سفر شروع ہوگیا۔ عائشہ راستے میں آنے والے ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور باغات سے لطف اندوز ہورہی تھی اور اپنے وطن کی خوبصورتی کے گُن گارہی تھی۔ ان کی گاڑی چوڑی چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑی جارہی تھی۔ وہ لوگ ایک طویل سفر کے بعد ملتان پہنچ گئے۔ انہیں سفر کی وجہ سے کافی تھکاوٹ ہورہی تھی۔ وہ ایک ٹیکسی کے ذریعے انکل کے گھر پہنچ گئے۔ ان کے انکل نے اپنے بھائی اور بھتیجی کو اچانک دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اور پھر آگے بڑھ کر بھائی کو گلے لگالیا۔ اور عائشہ کو پیار کیا۔پھر اندر لے آئے اور اندر آتے ہی اپنی بیگم کو آوازیں دینا شروع کردیں۔ "دیکھو بھئی کون آیا ہے؟"

"کون آیا ہے؟" عائشہ کی آنٹی نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔اور وہ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ عائشہ کے انکل کہنے لگے "بھائی صاحب ویسے یہ بہت بڑا سرپرائز ہے کہ آپ نے ہمیں اطلاع ہی نہ دی۔"

"بس یونہی پروگرام بن گیا۔" عائشہ کے ابو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

عائشہ اور اس کے ابو کو یہاں آئے ہوئے چار پانچ دن ہوئے تھے کہ ایک دن انکل نے بتایا "ہم ڈنر کے لئے حیدر صاحب کے گھر جائیں

کے۔ انہوں نے ڈنر پر مدعو کیا ہے۔"

"یہ حیدر صاحب کون ہیں؟" عائشہ نے چھا تو انکل نے بتایا کہ "جس دن آپ ملتان ئے تھے۔ اسی دن ایک صاحب اور ایک خاتون ئے تھے۔ وہ صاحب حیدر صاحب اور خاتون ں کی بیگم صفیہ تھیں۔ حیدر صاحب ہمارے دفتر ے ساتھی ہیں۔

کھانا بہت ہی لذیذ تھا۔ سب نے کھانے کی ت زیادہ تعریف کی اور داد دی۔ بیگم صفیہ ہنس ں کر داد وصول کر رہی تھیں۔ بیگم صفیہ اور ر صاحب بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ کھانے ے کچھ دیر بعد چائے کا دور چلا۔ ابھی چائے پی ہی تھی کہ اندر سے ایک بہت ہی خوبصورت، صوم اور کمسن لڑکی نمودار ہوئی۔ نزدیک آنے ے ادب سے سب کو سلام کیا۔ اور پھر بیگم ہ کے پاس جاکر ادب سے بولی۔ "باجی میں برتن دھو کر کچن صاف کردیا ہے۔ کیا اب جاسکتی ہوں؟"

"نہیں ابھی نہیں چند منٹ اِدھر ٹھہر جاؤ۔" اس فرمانبرداری سے گردن جھکائی اور جانے لگی۔ کو اس معصوم لڑکی نے بہت متاثر کیا۔

"سنو ادھر آؤ.....!" عائشہ نے اسے آواز ڈالی۔ اس نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر عائشہ کے قریب آگئی۔ دھیمے لہجے میں بولی۔ "جی باجی کوئی کام ہے؟"

"نہیں ادھر میرے پاس بیٹھو۔ یہ کیک لو.....!" عائشہ نے کیک کا ٹکڑا اس کی جانب بڑھایا۔

"نہیں شکریہ آپ کھائیں۔" عائشہ نے اصرار کیا، بیگم صفیہ نے بھی کہا "لے لو۔" اس نے "شکریہ" کہہ کر کیک لے لیا۔ تب عائشہ نے اس سے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا.....؟"

"میرا نام گڑیا ہے"

"کونسی کلاس میں پڑھتی ہو؟"

"جی چھٹی کلاس میں.....!"

"واقعی تم گڑیا کی مانند ہو۔ میرا نام عائشہ ہے کیا تم مجھ سے دوستی کروگی؟"

گڑیا نے سرہلا کر عائشہ کے دوستی کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور دونوں مسکرا دیں۔ بیگم صفیہ کو شاید یہ بات ناگوار گزری۔ تبھی تو انہوں نے گڑیا کو اندر جانے کو کہا۔

"یہ کون ہے؟" عائشہ نے بیگم صفیہ سے پوچھا۔

"چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ملازم رکھی ہے۔" بیگم صفیہ نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ یہ سن کر عائشہ کو دھچکا سا لگا۔ وہ تو سمجھ رہی

تھی یہ پیاری سی لڑکی بیگم صفیہ کی بیٹی ہے اور جب اس نے باجی کہہ کر جانے کا کہا تو عائشہ سمجھی تھی کہ شاید پڑوسن کی بچی ہو جسے ماں نے ہاتھ بٹانے کے لئے بھیجا ہوگا لیکن بیگم صفیہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ملازم ہے تو اسے بہت افسوس ہوا۔ افسوس اس وجہ سے نہیں کہ اس نے عائشہ سے دوستی کی تھی۔ شاید اس لئے کہ ابھی یہ پھول جیسے نازک ہاتھ کام کرنے کے قابل نہ تھے دوسرے بچوں کی طرح اسے بھی پڑھائی کے لئے آرام اور غم و فکر سے آزادی کی ضرورت تھی۔ مگر کتنے خود غرض ہیں اس کے والدین کہ اپنی گڑیا سی بیٹی کو دوسروں کے جھوٹے برتن مانجھنے کے لئے مجبور کردیا۔ اپنے آنگن میں کھلے ہوئے پھولوں کو کانٹوں میں پھنسا دیا تھا۔ یہ پھول مرجھا رہا تھا۔ وہ سوچتی رہی پھر اس کی سوچ کا رخ تبدیل ہوگیا۔ "شاید گڑیا کے گھر والے مجبوری کی بنا پر اسے یہاں بھیجتے ہوں۔" کچھ دیر بعد اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سب گھر والے الوداع ہونے کی تیاری میں تھے۔ لیکن عائشہ کے خیالوں میں گڑیا تھی صرف گڑیا......!

اس کی معصوم پیاری سی صورت کسی فلمی منظر کی طرح عائشہ کے سامنے گردش کررہی تھی۔ تقریباً" ایک ہفتہ عائشہ اور اس کے ابو انکل کے ہاں رہے۔ دو دن بعد ان کا واپس جانے کا ارادہ تھا۔ عائشہ کو کسی کام سے آنٹی کے ساتھ بازار جانا پڑا۔ اچانک عائشہ کی نظر ایک مانوس چہرے پر ٹک گئی۔ یہ چہرہ گڑیا کا تھا گڑیا ریڈی میڈ سوٹ پیک کروا رہی تھی۔ عائشہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ عائشہ نے اسے پکارا تو اس نے حسب معمول مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور سلام کیا۔

"کیسی ہو ..... ٹھیک تو ہو نا......؟" تمہارے ہاتھ میں اتنے سارے پیکٹ ..... تم تو ......؟" اس نے عائشہ کو بات مکمل نہ کرنے دی اور بولی "پلیز ادھر چلیں یہاں بہت رش ہے۔" پھر اس نے ایک پُروقار شخص سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ "یہ میرے ڈیڈی ہیں۔" عائشہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ عائشہ تو بس گڑیا کو ہی تکے جارہی تھی اور سوچ رہی تھی "یہ کیا ماجرا ہے؟ گڑیا بیگم صفیہ کے گھر میں نوکر کے روپ میں ملی تھی اور یہاں ......!" آخر عائشہ نے **جھجکتے جھجکتے** کہہ ہی ڈالا ..... "گڑیا وہ بیگم صفیہ تو تمہیں نوکر کہہ رہی تھیں۔"

"باجی وہ اگر مجھے نوکر کی بجائے کچھ اور بھی کہہ دیتیں تو میں تسلیم کرلیتی کیونکہ وہ میری استاد

ہیں۔ ٹیوشن بھی پڑھاتی ہیں وہ مجھے ..... میں تو ان کا حق ہی ادا نہیں کر سکتی۔ ماں باپ سے بڑھ کر رتبہ ہے ان کا۔ وہ بہت شفیق اور اچھی ہیں۔ میں ان کی کوئی بات نہیں ٹال سکتی۔ اگر انہوں نے آپ کے سامنے مجھے نوکر کہہ دیا تو کیا حرج ہے۔ میں اگر ساری عمر ان کی خدمت کرتی رہوں تو پھر بھی کم ہے۔" گڑیا کے دل میں بیگم صفیہ کے لئے محبت تھی۔ عزت تھی اس کے پاکیزہ خیالات سن کر عائشہ سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ عظیم لڑکی کی کتنی عظیم سوچ ہے۔ ایک وہ استاد ہے جس نے محض نمود و نمائش کے لئے اپنی معصوم شاگرد کو ملازمہ کہا۔ اور یہ گڑیا جو اپنی استاد کی عظمت کے گن گا رہی ہے۔ اس کا حق تسلیم کر رہی ہے۔ عائشہ کو بیگم صفیہ کی سوچ سے گھن آ رہی تھی۔ لیکن گڑیا کی عظیم سوچ پر پیار آ رہا تھا۔ بہت سی باتیں کرنے کے بعد گڑیا نے عائشہ سے وعدہ لیا کہ یہ بات وہ کسی کو نہیں بتائے گی اور پھر وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ واپس چلی گئی اور عائشہ بھی آنٹی کے ساتھ واپس گھر آ گئی۔

اب بھی کبھی عائشہ کو گڑیا کا خیال آتا ہے تو وہ اس چھوٹی سی لڑکی کی عظمت کو سلام کرتی ہے۔ جس نے اپنے طرزِ عمل سے سمجھایا تھا کہ استاد کی عزت اور احترام کس طرح کیا جاتا ہے۔

ہمارا عزم

اعجاز احمد شاہین

اندھیروں میں شمعیں جلاتے رہیں گے — مصیبت میں بھی مُسکراتے رہیں گے
نشاں تعصب مٹاتے رہیں گے — گلے غیر کو بھی لگاتے رہیں گے
لہو دے کے اپنا، زمینِ وطن کو — وقار اس کا ہر سو، بڑھاتے رہیں گے
ہے نامِ محمدؐ ہمیں جاں سے پیارا — جبیں ان کے در پر جُھکاتے رہیں گے

خلوص و وفا کے چمن زار میں ہم
محبّت کے غُنچے کِھلاتے رہیں گے

کوپن برائے خریداری آنکھ مچولی (۱۲ شمارے)

(۱۲ شماروں کی رعایتی قیمت اندرونی سرورق پر دیکھئے)

نام : ________ ولدیت : ________

کلاس : ________ تعلیمی ادارہ : ________

پتہ : ________________

براہِ مہربانی مجھے ________ تاریخ سے آنکھ مچولی جاری کردیا جائے

فون نمبر : ________ دستخط : ________

کوپن برائے "کیپشن لگائیے انعام پائیے"

نام : ________ ولدیت : ________

کلاس : ________ تعلیمی ادارہ : ________

پتہ : ________________

کیپشن : (________________)

کوپن برائے قصہ کوئز

نام : ________ ولدیت : ________

کلاس : ________ تعلیمی ادارہ : ________

پتہ : ________________

____

نوٹ : ہر شعبے کے لئے الگ کوپن آنا ضروری ہے ۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام آسکتا ہے ۔ کوپن کی فوٹو کاپی قابلِ قبول نہیں ۔

ننھا سفید بیل

ترجمہ : غلام مصطفیٰ سولنگی، شکارپور

ایک جنگل میں ننھا منا بیل اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا، جس کا رنگ سفید تھا، جیسے دودھ، چینی یا کاغذ کی چادر۔ جو بھی اسے دیکھتا تھا، وہ پوچھتا۔ "تمہارا رنگ اتنا سفید کیوں ہے؟"

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" وہ برا مان جاتا۔

ایک دفعہ سرخ چوزے نے کہا، "سرخ رنگ تو بہت خوبصورت ہے۔"

ننھے بیل نے چوزے کو غور سے دیکھا۔ واقعی وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ پھر اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ سارے پھول بھی سرخ تھے۔ "اس کا مطلب ہے کہ سرخ رنگ اچھا ہے، مجھے بھی سرخ ہی ہونا چاہئے۔"

یہ سوچ کر وہ گھر آیا اور ماں سے رنگ کا ڈبہ لے کر اپنے آپ کو سرخ کرلیا۔ "اب تو میں خوبصورت لگ رہا ہوں۔ چوزے بھائی نے مجھے اچھا مشورہ دیا تھا۔"

شام کو جب وہ نہانے کے لئے تالاب پر گیا تو اسے ایک مینڈک کنارے پر بیٹھا نظر آیا۔

"بیل بھائی، تم اتنے سرخ کیوں ہو.....؟" مینڈک نے پوچھا۔

"بس، مجھے سرخ رنگ بہت پسند ہے۔" بیل نے جواب دیا۔

"سرخ سے تو سبز رنگ اچھا ہے۔ دیکھیں میرا رنگ بھی سبز ہے اور میں کتنا خوبصورت اور پیارا لگ رہا ہوں۔"

ننھے بیل نے چاروں طرف دیکھا۔ مینڈک بھی سبز تھا۔ تالاب کا پانی درخت کے پتے اور گھاس بھی سبز تھی۔ "پھر تو سبز رنگ ہی مجھے جچے گا۔"

یہ سوچ کر وہ دوڑتا ہوا گھر آیا اور ماں سے رنگ کا ڈبہ لے کر اپنے آپ کو برش سے سبز کرلیا۔

دوسرے دن صبح کو وہ سیر کرنے جارہا تھا۔ تو راستے میں اسے ایک تتلی ملی۔ اس نے پوچھا' "بیل بھائی! تم اتنے سبز کیوں ہو؟"

"مجھے مینڈک میاں نے مشورہ دیا تھا کہ یہ رنگ اچھا ہے۔"

"نہیں ...... نہیں .... سبز سے تو نیلا رنگ بہتر ہے۔" تتلی نے کہا۔

ننھے بیل نے دیکھا تو تتلی کا رنگ بھی نیلا تھا اور آسمان کا بھی۔

"واقعی' نیلا رنگ اچھا ہے۔" اس نے سوچا۔

گھر آکر اس نے نیلے رنگ کا ڈبہ اٹھایا اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے آپ کو نیلا کرڈالا۔

وہ باہر نکلا تو اسے بی بطخ تالاب کے کنارے کھڑی ہوئی مل گئی۔ وہ بولی' "بھائی ننھے بیل! تم تو نیلے رنگ میں اچھے نہیں لگ رہے۔"

اس نے پوچھا' "کیوں' نیلے رنگ میں آخر کیا برائی ہے۔؟"

"برائی تو نہیں' لیکن سفید رنگ اچھا ہے' مجھے دیکھو میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہوں۔"

اس نے بی بطخ کا مشورہ مان لیا اور تالاب میں کود کر اپنے آپ کو صاف کردیا۔ اب وہ بالکل سفید ہوگیا تھا۔

وہ نہا دھو کر جارہا تھا تو راستے میں اسے سرخ چوزا مل گیا۔ "اوہ! بیل بھائی' پھر سے تم سفید ہوگئے۔ یہ کتنا برا رنگ ہے۔"

اس نے پوچھا' "کیوں برا ہے؟"

"بس تم سرخ رنگ میں ہی اچھے لگ رہے تھے۔" چوزے نے جواب دیا۔ اور اس طرح وہ پھر سے سرخ ہوگیا۔ اس کے بعد سبز' نیلا اور پھر سے سفید۔ آخر اس کی ماں نے تنگ آکر اسے کہا :

"تم بہت بیوقوف ہو۔ ہر چیز کے اپنے قدرتی رنگ ہوتے ہیں۔ اور ہر چیز اپنے رنگ میں ہی اچھی لگتی ہے۔ اور تم سفید رنگ میں ہی خوبصورت لگتے ہو۔"

اس کے بعد ننھے بیل نے کبھی بھی اپنا رنگ نہیں بدلا۔

اقراء

خالد بن محمود احمد

کون مسلمان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو نہیں جانتا؟

جی ہاں وہی ابراہیمؑ جنہیں ایک خدا کو ماننے کے جرم میں دہکتی آگ اور لپکتے شعلوں کے سپرد کردیا گیا تھا۔ اور وہی ابراہیمؑ جو رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی اور معصوم بچے کو عرب کے صحرا میں چھوڑ آئے تھے۔ اور وہی ابراہیمؑ جنہوں نے قدرت کی منشا پا کر بڑھاپے کی اولاد، نوجوان بیٹے کے حلق پر بے تکلف چھری چلا دی تھی۔

یہی ابراہیمؑ ایک دن اللہ تعالیٰ سے کہنے لگے۔ "اے اللہ مجھے دکھایئے کہ آپ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیسے کریں گے؟"

مرنے کے بعد زندگی تو ایمان کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ لہٰذا فوراً پوچھا گیا "کیا اس پر تمہارا ایمان نہیں ہے؟"

عرض کیا "بے شک ایمان ہے، محض دل کے اطمینان کے لئے درخواست کی ہے۔" تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "چار پرندے لے لو، ان کو خود سے مانوس کرلو۔ پھر ان کو ذبح کرکے ان کے ٹکڑوں کو بھی آپس میں ملادو۔ یہ ٹکڑے پہاڑ پر رکھ دو۔ اب پرندوں کو آواز دو وہ اڑتے چلے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔"

آپ نے غور کیا کہ اس چھوٹے سے واقعے میں اہل نظر کو کیا کیا بتادیا گیا ہے؟ ایک تو یہ کہ ایمان کے نور کو وجود میں اتار کر دلی اطمینان کے لئے سوچنا، غور و فکر کرنا اور تحقیق کرنا قطعاً برا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ایمان پکا ہے تو سیکھنے کے اس عمل کی خود اللہ تعالیٰ حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تجربہ اور تجربہ گاہ تک فراہم کرتے ہیں۔ اس سب کے بعد فرمایا گیا "اور جان رکھو۔" اس "جان رکھو" کے لئے قرآن پاک نے جو لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ ہے ..... وَاعْلَمْ ...... جس کا ترجمہ یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ (اس سارے تجربے کے بعد بطور نتیجہ) "اور علم حاصل کرو۔"

گویا جس بات کو بالواسطہ پسند کیا گیا اسی کو ہی براہ راست بھی ارشاد فرمادیا گیا۔

کیا سیکھنا، جستجو کرنا، علم میں اضافہ کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند نہیں ہے؟

یقیناً ہے اور اس میں کیا شک ہے۔

IMPORTED

QUICE

QUICE Lemon Lime

2 GREAT CANS

2 EXCITINGWAYS TO COOL DOWN & FRESHEN UP !

Quice Food Industries Ltd.

11/139, Jamaluddin Afghani Road, Near Bahadurabad

REGD. No. SS-246 December 1996
AANKH MICHOLEE KARACHI